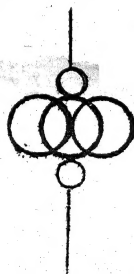


تاریخ وادب



مُصَنَّفٌ

محمد نور الدین خان

سلسلہ مطبوعات آد بستان دکن

- نام کتاب : تاریخ و آدب
- مصنف : محمد نور الدین خان
- تعداد صفحات : {۲۴}
- سنہ اشاعت : اپریل ۱۹۹۲ء
- تعداد اشاعت : (۵۰۰) پانچ سو

- کتابت : محمد عبدالرؤف خوشنویس
- سرورق : سلام خوشنویس

- طباعت لیتھو : ۵ اٹھ پرلین (چھتہ بازار، حیدرآباد)
- طباعت سرورق و تصاویر :
- اسپڈ آفیس پرنٹرس (راحت کدہ، روپر دفرج کالونی) سعیدآباد، حیدرآباد
- قیمت : پچاس روپے

- ★ جلد سازی : حفیظہ بیگ، بایئڈنگ ورکس چھتہ بازار، حیدرآباد
- ★ تصاویر : پاکیزہ اسٹوڈیو، یاقوت پورہ

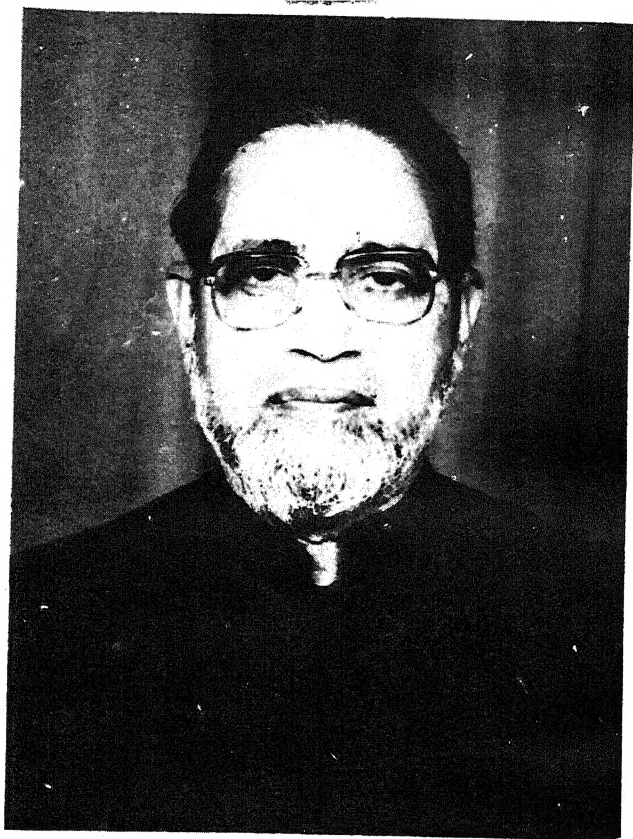
ملنے کے پتے :

اسٹوڈنٹس ہسٹل، چار میٹار، حیدرآباد

مُصنّفی ہسٹل، پھلی کمان، حیدرآباد

مُصنّف : 20-6-356

ڈیڑھی نواب شرف جنگ قیاض، پھوڑہ سیٹھی، حیدرآباد



مصنف، محمد نور الدین خان

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر
۷	انتساب	۱
۹	ایک حقیر علمی پیشکش	۲
۱۳	[تاریخ]	۳
۱۵	شہر حیدر آباد کی پہلی مسجد	۴
۱۹	محبت کی یادگار پرانا پل	۵
۲۰	تالاب مال صاحب	۶
۲۲	حیات بخش بیگم یا حیات بخش بیگم	۷
۲۵	شہر حیدر آباد کے چار قدیم پل	۸
۲۸	مکہ مسجد میں آصف جانی قبور	۹
۵۹	مکہ مسجد میں مقبرہ سلاطین آصفیہ	۱۰
۶۲	مسجد حودی اور مزار آصف صاحب	۱۱
۶۷	سواری شاہانہ اور غوام کی تکلیف کا احساس	۱۲
۷۷	جمال صاحب میاں	۱۳
۷۰	چیتوڑہ سید علی	۱۴
۷۵	نواب میر محبوب علی خاں اور سانپ کا غل	۱۵
۷۸	دکٹوریہ زنانہ اسپتال کی تقریب تنصیب سنگ بنیاد	۱۶
۸۰	حضور نظام کی اقتداء میں نادر	۱۷
۸۱	نواب دلی الدولہ بہادر کا سفر حج	۱۸
۸۷	حیدر آباد کے تاریخی واقعات شاعری میں	۱۹
۹۵	بیرونی مشاہیر ادب اور حیدر آباد	۲۰
۱۰۸	شاہی بے تاج پر ایک نظر	۲۱
۱۲۶	رستم زمان غلام محمد گاما (پہلوان)	۲۲
۱۳۲	استاد محمد بن علی بیہلوان	۲۳
	مولانا عبدالحق کی اردو لغت اور راست حیدر آباد	

صفحہ نمبر	عنوان	نشان
	[ادب]	
۱۳۸	مشاعرہ عرس حضرت فیض کی غزلیات کا پہلا مجموعہ	۲۲
۱۴۴	حبیب اللہ ذکا کی اردو ہجو	۲۵
۱۵۰	اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان آصف کی غزل پر خمسے	۲۶
۱۵۳	مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا خط نواب عزیز یار جنگ کے نام	۲۷
۱۵۸	شاعری میں مہاراجہ شاد کے استاد	۲۸
۱۶۳	مہاراجہ شاد کی تاریخ وفات	۲۹
۱۶۵	معشوقہ سرشار سکرم	۳۰
۱۶۷	رہسائے مصرعوں پر حضور نظام آصف سابع کی تضحیں	۳۱
۱۷۰	بے نظیر شاہ وارثی کو بلا طلب و سوال وظیفہ	۳۲
۱۷۴	والا شان شہزادہ نواب مظہر جاہ بہادر شجاع کے دو شعر	۳۳
۱۷۶	ڈاکٹر عکاس علی خان لمبر کے کلام پر اصلاح	۳۴
۱۸۱	یاس لیگانہ چنگیزی کی ملازمت و ترقی	۳۵
۱۸۳	شاعری جو بہر خدا داد	۳۶
۱۸۵	شعراے اردو کی حاضر جوابی	۳۷
۱۸۶	حضرت عشقی اور ان کے تذکرہ نویس	۳۸
۲۰۰	تا بان ایک شاعر ایک انسان	۳۹
۲۰۱	حلی آفتابی	۴۰
۲۱۳	واقعاتی شعر	۴۱
۲۱۷	آخری چہار شنبہ	۴۲
۲۱۹	دکن کا ایک نقاد	۴۳
۲۲۷	صدق جائسی مہاراجہ شاد کے دربار میں	۴۴
۲۳۲	حسن ترجمہ	

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنْتِسَابُ

بکمالِ ادب و اخلاص میرے کرم فرما
جناب شبلی یزدانی صاحب اور
جناب سید عبد الحفیظ صاحب۔

کے نام

جن کی رہنمائی اور فیضانِ صحبت نے لکھنے کا حوصلہ
عطا کیا۔ گریہِ خُریم نیتِ ستِ بزرگ!

محمد نور الدین خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک علمی پیش کش

مقامی اخباروں اور رسالوں میں وقفہ وقفہ سے میرے مراسلے اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تاریخی، ادبی نوعیت کے ہیں اور بعض تحقیقی ہیں۔ ان مضامین کو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور عام قارئین نے بھی اظہار پسندیدگی فرمایا۔ یہ مضامین ویسے دیکھنے میں معمولی موضوعات پر مبنی لیکن درحقیقت اہمیت کے حامل اس لیے ہیں کہ یہ ان تاریخی حقائق پر مبنی ہیں جن پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو وہ بے اصل اور سرسری طور پر اظہار خیال کے سوا کچھ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غیر ثقہ روایتوں اور افسانہ طرازی میں تاریخی حقائق گم ہو گئے ہیں۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تاریخ کیا ہے جھوٹ کا ایک پلندہ ہے۔ عصر حاضر کے محققین حمہ ریسرچ اسکالر کہلاتے ہیں ان میں سے بیشتر کی تحقیق کا انحصار ان ہی افسانوں اور سنی سنائی بے بنیاد روایتوں پر ہوتا ہے۔ میں نے کبھی اپنے مضامین میں قدیم یا جدید مورخین کی تحقیق کو خائنہ بستہ رابستن کے مصداق اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ذاتی علم اور عینی شاہدہ کی روشنی میں حقائق کی تلاش کی ہے اور آثار و اوقات کی تطبیق و موازنہ سے کام لیا ہے۔ غرض کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بڑی محنت اور جدوجہد کی ہے۔

یہ مضامین موتی طور سے اخباروں میں شائع ہو کر منظر عام پر آگئے لیکن اخباروں کی ایک روزہ زندگی پاکر ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے

اور صاحب ذوق تارتین کی بغایت توجہ سے محروم رہے۔ اس لیے میں نے ان پر آگندہ اور منتشر مضامین کو یکجا کر کے مجموعہ کی شکل میں شائع کرنا مناسب سمجھا۔ اس علمی سرمایہ کو میں اپنی حد تک بوجہ چند در چند عزیز رکھتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس کی قدر ہے چاہے اس کو کوئی قدر کی نگاہ سے دیکھے یا نہ دیکھے :-

از رد و ہم قبول تو فارغ نشہ ایم
لے آن کہ خوب مانہ شناسی ز زشت نما

ان مخلص اصحاب اور اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے طالب علمانہ علمی و تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی۔ خصوصاً محترم جناب محبوب حسین جگر صاحب سب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کا بہت پاس گزار ہوں کہ آپ نے ابتداء ہی سے میری نگارشات کو اخبار میں جگہ دے کر میرا بڑا حوصلہ بڑھایا اور بعض باتوں میں میری رہنمائی بھی کی۔
نا سہاسی ہوگی اگر میں میرے دوست جناب محبوب علیخان صاحب اشگر کا شکریہ ادا نہ کروں۔ موصوف نے کتنا بت، طباعت کے حلول اور متعلقہ دوسرے مسائل کی تکمیل میں مخلصانہ طور سے میرا ہاتھ بٹایا۔
محترم جناب محمود انصاری صاحب ایڈیٹر منصف کا بھی ممنون ہوں کہ میرے مراسلے اخبار میں شائع کرنے میں برابر تعاون فرمایا۔
آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مضامین کی طباعت کے لیے جزوی رقوم منظور کی۔

انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالب زرہم
سخن سخن خیم ہے ہون صلہ اپنا

محمّد نور الدین خان

۱۲ اپریل ۱۹۹۲ء

فون: 326423

مکان نمبر 356-6-20

دیوڑھی نواب مشرف جنگ نیازی ، چوتھ سید علی ، حیدرآباد دکن لے پی

北窓

شہر حیدرآباد کی پہلی مسجد

بانی سلطنت قطب شاہی سلطان قلی قطب الملک عرت بڑے ملک جب بحیثیت گورنر تلنگانہ اپنی جاگیر گوکنڈہ میں مقیم تھے تو انھوں نے پرانے قلعہ گوکنڈہ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور وہاں عمارتیں بھی بنوائیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان میں جہاں کہیں کسی راجہ بادشاہ امیر یا وزیر نے محل، باغ یا مقبرہ تعمیر کیا وہیں اعتقاداً سندریا مسجد بھی تعمیر کی۔ چنانچہ تعمیر گوکنڈہ کے ساتھ سلطان قلی نے قلعہ گوکنڈہ کی جانب مغرب ایک مسجد بنائی جو جامع مسجد گوکنڈہ کے نام سے مشہور ہے۔ بات اگرچہ موضوع سخن کے دائرے سے باہر ہے لیکن کہنے کو جی چاہتا ہے کہ دکن کی سرزمین کی آب و ہوا میں وفاداری کی خوبو ایک نمایاں صفت ہے چنانچہ قطب الملک بانی سلطنت قطب شاہی اور نظام الملک بانی مملکت آصفیہ دونوں کے کردار اسی وصف سے متصف ہیں۔ بہمنی حکومت کے زوال پذیر دور میں جب ماتحت گورنروں نے علم بغاوت بلند کیا اور اپنی اپنی آزاد حکومتیں قائم کر لیں تو سلطان قطب الملک آخری گورنر تھے جنھوں نے اپنی حکومت قائم کی لیکن انھوں نے کمزور اور نااہل آخری سلاطین بہمنیہ سے اپنے روابط و فادارانہ رکھے۔ ان کے نام سلطان قلی ہیں "سلطان" نام کا جنر ہے۔ ان کے مزار کے کتبہ پر بھی نام کے ساتھ لفظ شاہ کندہ نہیں ہے بلکہ بہمنی بادشاہ کا عطا کردہ خطاب قطب الملک کندہ ہے۔ یہ اسی وفادارانہ بلند حوصلگی کا ثبوت ہے کہ حکومت قطب شاہی اور اس کے تمام سلاطین کے نام کے ساتھ لفظ قطب بطور یادگار شامل ہے۔

جامع مسجد گوکنڈہ کے باب الدافلہ کے اوپر ایک کتبہ بزرگان عربی

بشکل طغرا لکھا ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ غازی محمود شاہ ابن محمد شاہ
بہمنی کے عہد میں سلطان قلی المخاطب بقطب الملک نے سنہ ۹۲۲ھ میں
یہ جامع مسجد تعمیر کی۔

حیدر آباد کے آثار، عمارت، مقابر اور مساجد میں محققین اور مورخین نے
کتاہیں لکھی ہیں وہ انہوں نے بتایا ہے کہ قطب شاہی دور میں شہر حیدر آباد
میں جو پہلی مسجد بنی وہ چار منیار کے قریب جانب شمال جامع مسجد ہے جس کی
تعمیر سلطان محمد قلی قطب شاہ نے کی۔ یہاں کوئی ایسا کتبہ نہیں ہے جس پر سنہ
بنائے مسجد کندہ ہو۔ محراب مسجد کے اطراف سنگ سیاہ کے حاشیے پر آیات
قرآنی خط ثلث میں کندہ ہیں اور آخر میں کاتب نے اپنا نام جمال الدین بن جلال الدین
محمد الفخار الشیرازی لکھا ہے اور وہیں سنہ ایک ہزار چھ بھی کندہ کیا۔ یہاں ڈاڑھی
الکھن یہ ہوتی ہے کہ کاتب نے جو سنہ لکھا ہے آیا وہ سنہ تکمیل ہے یا سنہ
بنائے مسجد جامع مسجد کے مغرب میں قدیم باب الداخلہ جس میں اب خفیج بکڑ لو
قائم ہے کی پیشانی پر جو سات اشعار کا کتبہ ہے۔ اس کا آخری شعر ہے
کے پر سد اگر تاریخ اور ا

زہے عالی بنائے خیر گوئی

۱۰۰۶

زہے عالی بنائے خیر کے حروف کے اعداد جوڑنے سے ایک ہزار چھ ہرآمد
ہوتا ہے۔ اس طرح کاتب نے جو سنہ لکھا ہے وہ سنہ بنائے مسجد ہی ہے۔
آئیے اب ہم آپ کو ایک اور مسجد لے چلتے ہیں جو چار منیار کے قریب
مکہ مسجد کے سامنے اور قلب شہر میں واقع ہے۔ نام اس مسجد کا بیگم کی مسجد
ہے۔ محققین کی نگاہ تحقیق سے یہ مسجد اوجھل رہی اور کسی تاریخ یا حیدر آباد
کے آثار پر لکھی گئی کتاب میں اس کا کوئی ذکر یا داخلہ نہیں ہے۔ (البتہ حیدر آباد
کے محقق جناب عمر یانعی مرحوم نے اس مسجد پر ایک مضمون لکھا ہے) اس کی
وجہ یہ تھی کہ عرصے تک یہ مسجد ہمت جنگ، تہنیت یار الدلہ کی دیوڑھی کی
ادبچی دیواروں کے چلتے میں پوشیدہ رہی۔ مغربی جانب جہاں اب پان کی کوئی

و منزل عمارت کھڑی تھی اور اس کے پیچھے دوکانیں تھیں۔ وہیں تہنیت یار الدولہ یوڑھی کا اونچا بڑا اور قدیم پھاٹک تھا۔ جب دواخانہ یونانی کی تعمیر شروع تو اطراف کی ڈیوڑھیاں اور مکانات منہدم ہوئے تو یہ مسجد ابھر کر منظر پر نمایاں ہو گئی۔

محراب مسجد کے اطراف صاف چکنے سنگ سیاہ کا حاشیہ ہے جس پر آیات ابھرتے ہوئے بہت ہی خوب صورت عربی خط میں منقوش ہیں۔ خاتمے پر نے اپنا نام جمال الدین حسین الفجار لکھا ہے۔ کمانِ محراب کی پیشانی پر سنگ کی پٹی پر خط عربی بطرز طغرا حضرت محمدؐ۔ حضرت علیؑ اور اماموں کے نام ہیں اور آخر میں سنہ ایک ہزار و د (۱۰۰۲) کے اعداد کندہ نظر آتے ہیں۔ تاریخ بنائے مسجد کا کتبہ کسی وقت یہاں ہو گا مگر امتداد زمانہ کے ہاتھوں کا وجود نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے واضح کیا ہے کہ جامع مسجد چار بیٹا حرابی کتبے پر کاتب نے جو سنہ ایک ہزار چھ (۱۰۰۶) لکھا ہے وہ سنہ تعمیر ہے۔ اسی طرح اس مسجد کی محراب کے اوپر کاتب نے جو سنہ ایک ہزار (۱۰۰۲) لکھا وہ یقیناً سنہ تعمیر مسجد ہی ہے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے۔ دونوں مساجد کے کتبوں پر خوب صورت خط میں لکھنے والے کاتب وہی پ شاہی دور کے ماہر فن خطاط جمال الدین حسین ہی ہیں۔ دونوں مسجدوں کتبوں کی نفیس دل کش اور بے مثل تحریر میں اسی لیے یکساں پائی جاتی ہے۔ کتبہ نہ ہونے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس مسجد کی تعمیر کس نے کی۔ لیکن اس رز تعمیر وہی ہے جو قطب شاہی مسجد کی خاص خصوصیت ہے وہی چار محاذوں پر قائم گنبد نما چھت، وہی طاق وہی محراب، غور کرنے سے یہ حقیقت ملتی ہے کہ سلطان محمد ثانی قطب شاہ کا دورِ حکمرانی سنہ نو سو اٹھاسی (۹۸۵) سے ایک ہزار بیس (۱۰۰۲) رہا ہے یقیناً جب سنہ ایک ہزار ہجری شہور عمارت چار مینار بنی تو اس کے پہلو میں بادشاہ کے حکم سے یہ مسجد رہی ہوگی کیوں کہ تو تعمیر شدہ شاہی عمارت کے قریب کسی دور کو مسجد بنانے

کی اجازت یا مجال نہیں ہو سکتی۔ پھر جب باقی شہر حیدرآباد محمد قلی کی سنا جاتا
بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی۔

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیع

تو شہر کی آبادی میں دن در دن اضافہ ہونے لگا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر
بادشاہ وقت نے چار بنیاد کے قریب ایک بڑی جامع مسجد کی تعمیر کی اور آخر
میں مکہ مسجد جیسی عظیم الشان مسجد شہر حیدرآباد کی زینت بنی۔

سلطان قلی قطب الملک نے گوکنڈہ میں جو جامع مسجد بنائی۔ اس کا طرز
تعمیر قطب شاہی دور کی مساجد سے مختلف ہے۔ قطب شاہی مساجد کا طرز
تعمیر مخصوص نوعیت کا ہے اور یہ آرٹ قطب شاہی دور کی تمام مساجد میں یکساں
موجود اور نمایاں ہے۔ چاہے وہ کسی بادشاہ کی تعمیر شدہ ہو یا کسی امیر کی۔
زیر بحث مسجد شہر حیدرآباد اور قطب شاہی دور کی پہلی مسجد ہے۔ اور قطب
شاہی طرز تعمیر کا پہلا نمونہ اور ماڈل بھی یہی مسجد ہے۔ اس کے بعد چھوٹی اور
بڑی جتنی بھی مسجدیں بنیں اسی ماڈل کے طرز پر بنیں۔

اس میں کوئی شک نہیں جامع مسجد گوکنڈہ حیدرآباد کی قدیم مسجد ہے
لیکن ہم اسے قطب شاہی دور کی مسجد نہیں کہہ سکتے کیوں کہ سلطان قلی نے
بحیثیت بادشاہ اس کی تعمیر نہیں کر دائی تھی بلکہ بحیثیت گورنر یا نائب حکومت
بہمنیہ یہ مسجد بنائی تھی۔ زیر بحث مسجد پہلی قدیم قطب شاہی مسجد ہے جو جامع
مسجد چار بنیاد سے چار سال پہلے اور مکہ مسجد سے پچیس سال پہلے شہر حیدرآباد
میں تعمیر ہوئی۔ چار سو پانچ سال اس کی عمر ہونے کے باوجود مسجد سانچے میں
طرحی معلوم ہوتی ہے۔ گچ اور چونا اتنا سخت جان ہے کہ ابھرے ہوئے نازک
نقش و نگار اسی حالت میں ہیں جیسے بنے تھے۔

عرصہ تک یہ مسجد تہنیت یار الدولہ کی لڑائی نادر النساء بیگم کی زیر نگرانی
رہی۔ لیے یہ بات عینی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے قبضہ و تصرف میں چھنے

نسبت سے یہ مسجد بیگم کی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔
 ہے۔ سوائے جمعہ اور عیدیں، پانچ وقت کی نماز کثیر جاعت
 ہے۔ امام اور موزن کا انتظام ہے۔ مسجد کی انتظامی کمیٹی
 الیم اور قرأت کا مدرسہ قائم ہے۔ استاد محمد بن عیسیٰ صاحب
 کو روزانہ صبح مسجد میں پڑھاتے ہیں۔

عرض کرنا ہے کہ تحقیق کسی کی بھی ہو قول فیصل ہے نہ حرف
 بر زخار کا کوئی کنارہ نہیں نہ اس کھٹن راستہ کی کوئی منزل
 رمین اور محققین کرام کی نظر میں اس مسجد سے بھی کوئی مسجد
 قدیم ہو تو ضرور تبصرہ کریں۔ یقیناً دکن کی تاریخ میں نئے

گا۔

محبت کی یادگار پُرانا پل

کے شمال مغرب میں پُرانا پل واقع ہے جو کاروان دستعد
 کے شمالی کنارے سے شروع ہو کر جنوبی کنارے پر ختم
 ڈھ کی عمارتوں کے بعد سلطان ابراہیم قطب شاہ نے
 طب شاہی دور میں اسے پل "نردا" کہتے تھے "نردا" تلگو زبان
 میں آصف جاہی عہد میں پل کی قدامت کی وجہ پُرانا پل
 وقت پل پر کہیں کوئی کتبہ نصب نہیں ہے۔ لیکن تمام تاریخ
 ریخ آغاز بنائے پل "صراط المستقیم ۹۸۱" لکھا ہے اور تاریخ
 ذیل ہے ۷

رخت او گذر ما و ما برا و گذریم !
 از این سبب شدہ تاریخ او گذر گہ ما

دکن کی قدیم فارسی تاریخ ”ظفرہ“ کے مولف نے ظفرہ کے حروف کے اعداد کو سمجھنا لایا ہے یعنی ۱۱۸۵ء گویا یہ تاریخ حکومت قطب شاہیہ کے خاتمہ ۱۰۹۸ھ کے ۸۷ سال بعد پائے تکمیل کو پہنچی۔ مولف تاریخ ”ظفرہ“ گردھاری لال نے ”بنائے جبر یعنی پل“ لکھا ہے کہ چونکہ شہر اور قلعہ کے درمیان دریا سے موسیٰ واقع ہے موسم برسات میں طغیانی کے سبب عبور کرنا دشوار تھا۔ اس لیے خسرو دماں نے اس مضبوط پل کی تعمیر کی مولف کے بیان سے واضح ہے کہ رفاہ عام کی غرض سے اس پل کی تعمیر ہوئی۔

”ظفرہ کے بعد دکن کی جو مستند اور مشہور تاریخ ملتی ہے وہ گلزار آصفیہ مولفہ جناب خواجہ غلام حسین خاں ہے جو ۱۶۲۰ھ فارسی میں لکھی گئی یعنی سلطنت قطب شاہی کے زوال کے ایک سو باسٹھ ۱۶۲ سال بعد صاحب گلزار آصفیہ نے اس پل کے بنانے کی وجہ یہ بتائی کہ سلطان ابراہیم قطب شاہ کا شہزادہ محمد قلی قطب شاہ بھاگ متی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جو موسیٰ ندی کے اس پار موضع چچلم میں رہتی تھی۔ شہزادہ اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ شہزادہ حب معمول رات کے وقت کوہ پیکر ہاتھی پر سوار ندی کے کنارے آیا۔ لیکن یہ سبب طغیانی ندی چڑھا دے تھی۔ ہاتھی کو بھی طوفانی ندی میں قدم ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شہزادہ کے دل میں جذبہ عشق جوش زن تھا۔ اپنے خاص گھوڑے پر فوراً سوار ہو کر گھوڑے کو عبور پر ندی میں ڈال دیا اور صحیح و سلامت دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ جب پرچہ نویسوں نے بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو وہ بہت متاثر ہوا۔ سجدہ شکر بجا لایا اور فوراً ایک مستحکم پل کی تعمیر کا حکم دیا۔

غور کرنا یہ ہے کہ مستند تاریخ نگاروں نے صاحب گلزار آصفیہ کے بیان کردہ افسانہ کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس واقعہ کو پل کی تعمیر کی بنیاد قرار دیا اور محبت کی یادگار بتایا۔ ملاحظہ ہو ناشر دکن، تاریخ گوگلکٹڈ

سُلطان محمد ثانی قطب شاہ وغیرہ وغیرہ۔ اب عرض کرنا یہ ہے کہ سُلطان محمد ثانی قطب شاہ کی تاریخ پیدائش ۹۷۳ھ پر بغیر کسی اختلاف تمام تاریخ نگاروں کا مکمل اتفاق ہے۔ اگر ہم متذکرہ افسانہ عشق کو تسلیم کریں تو یہ ماننا پڑے گا کہ جب اس پُل کی بنیاد ۹۸۱ھ میں رکھی گئی تو اس وقت شہزادہ کی عمر ۸ سال تھی [۹۸۱ - ۹۷۳ = ۸] آٹھ سال عمر کے کمسن نابالغ شہزادہ کا اپنی محبوبہ بھاگ متی سے والہانہ عشق اور شوق ملاقات میں بھیا نک رات کو طوفان بدوش ہندی میں گھوڑا ڈال کر لہروں سے کھیلنے ہوئے دوسرے کنارے پہنچ جانا دنیا سے عشق کا حیرت انگیز قابلِ فخر کارنامہ اور تاریخ کا عجوبہ روزگار نادر واقعہ ہے۔

ناچیسڑ نابالغ نظر ناظرین سے التماس کرتا ہے کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں مجھ گم کردہ راہِ حقیقت کی رہبری فرمائیں۔

تالاب مال صاحب

تالاب مال صاحب عہدِ قطب شاہیہ کے مشہور تالابوں میں سے ایک رہا ہے۔ قطب شاہی دور میں یہ تالاب جہاں واقع تھا اس علاقہ کو خیر آباد کہتے تھے۔ اے بی کارڈز سے مہدی پٹنم کے راستے مغرب کی جانب ایک طویل اور عریض نشیبی علاقہ نظر آتا ہے یہ نشیبی زمین اس میٹھے ہومے تالاب کا پتہ دیتی ہے۔ مشرقی سمت مٹی کا بندھ باندھ کر پانی روکا گیا تھا اور یہی بند آج بھی آمدورفت کے لیے پُل کا کام دیتا ہے۔ پانی سے کبھی یہ تالاب بھر لوہ رہتا تھا۔ جس کا پانی آبرسانی اور آبپاشی کے اغراض کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تالاب کے اطراف کھیت تھے۔ زراعت ہوتی تھی۔ آج سے تیس چالیس سال قبل تک یہاں کچھ کھیت باقی تھے۔ لہلہاتے کھیتوں کے درمیان درختی عمارتوں، کھڑی ہیں۔ برسوں سے یہ تالاب خشک اور

پایاب ہے نہ اس میں پانی ہے نہ اس کے اطراف کھیت، پایاب تالاب میں عوام کے لیے آج کل گورنمنٹ کی جانب سے چمن بنادیا گیا ہے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے بے ساختہ مخدوم کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

نہ اب وہ کھیت باقی ہے نہ ہے آب رواں باقی

مگر اس عہدِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشان باقی

صدیوں گزر جانے کے بعد بھی اس دھندلے نشان کو تالاب مالک صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیوں نہ یاد کریں جب کہ اس تالاب کو بنانے والی نیک دل خاتون نے اسے مرث کا رخسار اور ثواب جاریہ کے جذبہ سے بنایا تھا۔ اس تالاب کے جنوب مغربی سمت لب سڑک دو کمانوں والی پتھر کی چھوٹی عمارت ایستادہ تھی اور اس کے اندر پتھر کی دیوار میں چکنے پتھر کا کتبہ موجود تھا، جس کے حروف اُبھرے ہوئے تھے یہ کتبہ اس عمارت میں دسمبر ۱۸۶۹ء کے پہلے ہفتہ تک باقی تھا۔ لیکن آخر دسمبر ۱۸۶۹ء یہ تاریخی عمارت سڑک کی توسیع کی زد میں آگئی اور دیکھتے کے دیکھتے زمین کے برابر ہو گئی۔ اب نہ وہ عمارت ہے نہ وہ یادگار۔ کتبہ۔ یہ تو انقلابات ہیں زمانے کے لیکن ان تاریخ نگاروں کا احسان ہے جنہوں نے شوق تحقیق میں مشقتیں اٹھا کر قدیم عمارتوں، قبروں اور کتبوں پر تحقیقی کام کیا۔ فوٹو لیے اور چہرے اُتارے اور انہیں اپنی کتابوں میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔

خدا رحمت کنداں عاشقانِ پاکِ طہیت را

ایسی ہی یادگار کتابوں میں جناب سید علی اصغر بلگرامی مرحوم صاحبی ظم آثار قدیمہ حکومت حیدرآباد دکن کی دو کتابیں مآثر دکن (اردو) اور لیانڈ مارکس آن دکن (انگریزی) ہم اہل دکن کے لیے قیمتی سرمایہ۔ جن میں عہدِ قطب شاہی اور دورِ آصف جاہی کی بعض قدیم تاریخی

عماروں وغیرہ کے فوٹوز محفوظ ہیں۔ حوادث روزگار کے ہاتھوں تاریخی آثار صفحہ ہستی سے ملیا میٹ ہو جائیں گے لیکن کاغذی پیریں میں ان سے نقوش پتھر کی لکیر سے زیادہ پائیدار بن کر ہمیشہ باقی رہیں گے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تالاب اللہ صاحب کا تذکرہ کتبہ نہ جانے کس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ لیکن اس کتبہ کا عکس مآثر دکن میں موجود ہے۔ کتبہ فارسی میں ہے مختصر اس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ اس تالاب کو عالی مرتبت خانم آغا بنت میر مقصود علی طباطبائی نے بغرض زفاہ عام اور ثواب جاریہ خیر آباد میں تعمیر کیا اور اس تالاب کو بادشاہ نے شاہ خوند کار ابن شاہ محمد محسنی کو انعام میں عطا کیا۔ کتبہ پر ۱۰۳۲ درج ہے اصل کتبہ کے لیے ملاحظہ ہو مآثر دکن کا تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خانم آغا شہزادہ محمد مرزا ابن ابن سلطان ابراہیم قطب شاہ کی بیوی، سلطان محمد قطب شاہ کی والدہ حیات بخش بیگم کی ساس اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی داد تھیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شاہ خوند کار خانم آغا کے لڑائے سے تھے جن کو یہ تالاب انعام میں دیا گیا۔ خانم آغا اور شاہ خوند کار کی قبریں سلطان محمد قطب شاہ کے گنبد کے اندر موجود ہیں۔ قبروں پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ خانم آغا کے مزار کا کتبہ شاندار القاب سے مزین ہے: "علیہا حضرت خدیجہ مرتبت مریم مکانی بلقیس زمانی صالحہ عقیقہ رابعہ راکعہ ساجدہ صائمہ خانم آغا ۱۰۳۱ مزار کے کتبوں سے ظاہر ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ۱۰۳۵ اور شاہ خوند کار کا ۱۰۲۵ میں ہوا تھا۔ تاریخ بنائے تالاب کا کتبہ دستور کے موافق یقیناً ہوگا۔ مگر دست برد زمانہ سے اب ناپید مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس تالاب کو خانم آغا نے اپنی زندگی میں اپنی وفات ۱۰۳۱ سے قبل بنایا تھا۔ اور اسے سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے انتقال ۱۰۳۵ سے ایک سال پہلے ۱۰۳۲ میں اپنے بھانجہ خوند کار

کو انعام میں عطا کیا۔ حیات بخش بیگم سلطان محمد قطب شاہ کی ملکہ تھیں۔ اگر یہ تالاب ان کا بنایا ہوا ہوتا تو یقیناً خانم آغا کے بجائے حیات بخش بیگم کا نام کتبہ کی زینت ہوتا۔ تاریخ نگاروں کا یہ کہنا ہے کہ مغلیہ دور میں محل کی بڑی اور با اثر خواتین کو بیگم صاحبہ کا لقب دیا جاتا تھا اس طرح محل کی ایسی ذی مرتبہ بیگمات اور ماؤں کا لقب قطب شاہی عہد میں "مال صاحب" ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مال صاحب کا لقب کسی ایک شخصیت تک محدود نہ تھا۔ اس لحاظ سے خانم آغا بھی مال صاحب کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اور حیات بخش بیگم بھی مال صاحب کے لقب سے مشہور ہوئی۔ متذکرہ کتبہ پر خانم آغا کا نام اور ذکر واضح الفاظ میں یہ بحیثیت بالی تالاب موجود ہے۔ لیکن یہ بڑا تعجب ہے کہ جناب غلام حسین خان صاحب اپنے تذکرہ گلزار آصفیہ میں اس تالاب کو حیات بخش بیگم کا بنایا ہوا بتاتے ہیں۔ پھر تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ دکن کے بعض مشہور مورخ اور محقق بھی اس تالاب کو حیات بخش بیگم سے منسوب کرتے ہوئے اسے ان کے وفاء میں کارناموں میں شامل فرمایا ہے۔ خانم آغا (مال صاحب) نے جن نیک مقصد اور صالح نیت سے تالاب بنایا اس کا اجر ان کو اللہ کے دربار سے ضرور ملتا ہوگا۔ لیکن پھر بھی ان کے کام اور نام کو نظر انداز کر کے کسی اور کے اعمال نامہ میں شامل کرنا انصاف کی بات نہیں۔ میں نے جو دیکھا، پڑھا اور سمجھا وہ لکھا۔ یہ بھی تحقیق کو شش کی ایک کڑی ہے۔ اصحاب نظر کی رائے میرے لیے رہبری کا سبب ہوگی۔

حیاتِ بخشِ بیگم یا حیاتِ بخشِ بیگم

حیاتِ بخشِ بیگم عزنِ حیاتِ مالِ صاحبِ سلطنتِ قطبِ شاہیہ کے
 پانچویں بادشاہ سلطان محمد علی قطب شاہ کی بیٹی، چھٹے بادشاہ
 سلطان محمد قطب شاہ کی بیوی اور ساتویں بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ
 کی والدہ کا نام ہے۔ حیاتِ بخشِ بیگم کا شاندار گنبد مقابرِ سلاطینِ قطب شاہیہ
 (گوکٹنڈہ) میں موجود ہے۔ قبر کے کتبہ پر وفاتِ جنتِ مکاری حیاتِ بخش
 بیگم تہ تاریخِ بست و ہشتم ماہ شعبان شب سہشنبہ ۱۰۷۷ھ کو لکھا ہے۔
 تاریخِ حیاتِ بخشِ بیگم کا لکھا ہوا ملاحظہ ہو تاریخِ قطب شاہیہ، نگارِ آصفیہ عبدالرزاق خان گنڈوان
 دی نظاس ڈومین اور پکٹوریل حیدرآباد وغیرہ۔ لیکن بعض مشہور مورخ
 اور محققین نے انے تذکروں میں حیاتِ بخشِ بیگم کے بجائے حیاتِ بخشِ بیگم
 نام لکھا ہے۔ جیسے انگریزی تذکرہ ہسٹری آف میڈیول دکن میں جناب ہارڈن
 شیروانی صاحب نے (دی قطب شاہزاد گنڈہ حیدرآباد) جناب
 عبدالجبار صاحب نے تاریخِ گوکٹنڈہ میں، جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب نے
 "حیاتِ بخشِ بیگم" میں اور ڈاکٹر نور نے سلطان محمد علی قطب شاہ میں اس
 ملکہ کا نام حیاتِ بخشِ بیگم لکھا ہے۔ آج کل مضمون نگار اپنے مضامین میں ان
 معروف محققین کے اتباع میں حیاتِ بخشِ بیگم ہی نام لکھ رہے ہیں۔ صحیح نام کی جو
 اہمیت ہے وہ اصحابِ علم و دانش پر واضح ہے۔ ان حالات میں مجھ جیسے تاریخ
 کے طالبِ علم کے لیے صحیح نام کے تعین میں بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ قارئین
 سے معروضہ ہے کہ اپنی اصابتِ رائے سے اس الجھن کو ٹوڈ

شہر حیدر آباد کے چارویں پل

”پُرانا پل“

جب گوکنڈہ کی آبادی بڑھنے لگی تو حکومت قطب شاہیہ کے چوتھے بادشاہ سلطان ابراہیم قطب شاہ نے رود موسیٰ کے جنوب میں وسیع و عریض پُر فضا قطعہ زمین پر نئے شہر کے بسانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے آمد و رفت کے پیش نظر اس پل کی بنا ڈالی۔ یہ پل شمال میں کاروان (مستعد پورہ) سے شروع ہو کر جنوبی کنارے پر ختم ہوتا ہے۔ پل بائیس کمانوں پر بنا ہوا موسیٰ ندی میں ہر سال تباہ کن طغیانی برپا ہونے کا اندازہ سلطان ابراہیم قطب شاہ کو تھا۔ اس لیے پل کو نہایت مستحکم بنیادوں پر مضبوط گچ کے ساتھ سنگ بستہ بنایا اور استوار کیا۔ قطب شاہی دور میں اسے پل نروا د نروا تلگو میں راستہ کو کہتے ہیں [کہتے تھے مولف تاریخ ظفرہ گردھاری لعل نے اسے ”جسٹیم“ لکھا ہے (جس عربی میں پل کو کہتے ہیں) آصف جاہی دور میں اس کی قدامت کی وجہ پل قدیم یا پُرانا پل کہنے لگے۔

حسب دستور کہیں نہ کہیں پل پر کتبہ نصب ہوگا لیکن انقلابات زمانہ کے ہاتھوں اب اس کا وجود نہیں ہے البتہ محققین اور مورخین نے تاریخ بنائے پل ”صراطِ مستقیم“ بتایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ پانچ سال بعد اس پل کی تکمیل ہوئی۔ تاریخ لکھیں پل تواریخ میں یوں درج ہے:

ز سخت او گذر ماد ما براو گذریم

از این سبب شدہ تاریخ او گذر گہ ما

”گذر گہ ما“ سے مادہ تاریخ سنہ ۹۸۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

بعض وقت فردری ترمیم و مرمت اس پل کی ہوتی رہی چنانچہ ^تمخبر
معفرت منزل لواب سکندر جاہ بہادر کے دور میں سنہ بارہ سو چھتیس ۱۲۳۶ھ
کی طغیانی کے بعد جو ترمیم ہوئی اس کا قطعہ تاریخ فرمودہ دیوان چندو لعل
شادان آج بھی پڑانے پل کے دروازہ کے اوپر پتھر کی تختی پر کندہ نظر آتا ہے۔

بعد شاہ سکندر شاہ تعمیر پل یکسر

رسمی راجہ چندو لعل از سابق بود بہتر

بہ شادان شد ندا "جائے غریب" بہر تار بخش

ز سیل انیک لور محفوظ چوں اندر صدف گوہر

مادہ تاریخ "جائے غریب" سے سنہ ۱۳۳۶ھ نکلتا ہے۔ پل کی ترمیم پورن سنگھ
کی نگرانی میں ہوئی تھی اس لیے کتبہ کے دائیں طرف سنہ ۱۳۳۶ (۱۸۲۰ء)
کے ساتھ "تحویل پورن سنگھ داروغہ" بھی کندہ کیا گیا ہے۔

قطب شاہی دور ہو یا آصف جاہی عہد ہر سال آنے والی قیامت خیز
اور تباہ کن طغیانیوں کے باوجود چار سو ستائیس (۲۲۷) سال عمر کا یہ پل شکستہ
اور اذکار رفتہ نہیں ہوا۔ جب مولانا ظفر علی خاں کا قیام حیدر آباد میں تھا تو
ان کی ادارت میں ماہ نامہ "دکن ریلوے" شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے میگزین میں
صاحب نے دکن ریلوے اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ء میں تاریخی ہلاکت خیز طغیانی کا حال
"قیامت صغریٰ" کے عنوان سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ہندی کے چار پلوں میں
سے تین کے پرچھے اڑ گئے یعنی مسلم جنگ کا پل، چادر گھاٹ پل اور نیا پل
جو موجودہ فن انجینئری کی اعلیٰ کاریگری کا نتیجہ تھے خاص کر نئے پل کو پانی
کی طغیانی نے ردی کی طرح دھنک ڈالا۔ البتہ پُرانا پل جو زمانہ قدیم کی صفت
تعمیر کی یادگار ہے اور جو صدیوں سے آفات زمانہ کا مقابلہ کرتا چلا آ رہا ہے
کا پچھلے طوفانوں میں بھی بال بیکانہ ہوا تھا سوائے اس پچھے پوتے کے جو زمانہ
مابعد میں ہوئے تھے اور جو بہہ گیا ٹس سے ٹس نہ ہوا اور سینہ سپر کئے ٹھٹھا
رہا۔"

تمام سوخ اس پل کی مضبوطی کا شاندار الفاظ میں ذکر کرتے آئے ہیں۔
 آج بھی بھاری بھاری ٹرکس، ہر اقسام کی سواریوں اور ازدحام رات دن اس
 پل پر سے گزرتا دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پل پر کھڑے ہو کر دیکھئے
 تو محسوس ہوتا ہے گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

ثبت است بر حسیبہ عالم ددام سا

چادر گھاٹ پل

قدیم سے شہر حیدرآباد میں داخل ہونے کا واحد پل، پرانا پل ہی تھا۔
 پرانے پل کی تعمیر کے دو سو پینٹھ (۲۶۵) سال بعد اعلیٰ حضرت غفرلہ
 منزل لڑا ب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ چہارم کی مددگینی
 [۱۲۴۳ھ] کے دو سال بعد رود موسیٰ پر دوسرا پل [۱۲۴۴ھ] میں جو تعمیر ہوا
 وہ بمقام چادر گھاٹ بنایا گیا۔ یہ پل چادر گھاٹ پل کے نام سے مشہور ہے۔
 لیکن ریڈیٹنی کے ایک انجینئر مشر الیفٹ [COLIAPHENT] کی
 نگرانی میں اس پل کی تعمیر ہوئی اس لیے الیفٹ کے پل سے بھی موسوم ہے
 آج بھی پل کے جنوبی سمت پولس اسٹیشن سے متصل الکٹرک آفس کی عمارت پر
 بزیان انگریزی گچ کے اُبھرے ہوئے الفاظ میں الیفٹ برج سب اسٹیشن
 لکھا ہوا ہے۔

اس پل کی تعمیر کا مقصد رفاہی ہے۔ عوام کے لیے آمد و رفت کی سہولت
 پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ تھی کہ انگریزوں کا افسوس و سوخ دہی
 ریاستوں پر بڑھ رہا تھا۔ اس وقت کے انگریز ایملی (ریڈیٹنی) میجر اسٹوٹ
 کو نظام سے ملنے کے لیے پلانے پل کا طویل طویل راستہ طے کرنے کے
 بجائے قریبی راستہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز آفیسر کو سیر و شکار
 کے لیے سرحد نگر کی شکار گاہ جانے کی سہولت نہ تھی۔ چنانچہ اس پل کی تعمیر

میں خود سٹورٹ اور دیوان مہاراجہ چندو لعل بہادر نے بڑی دلچسپی لی۔ ایک سال کے اندر پل کی تعمیر کا کام ختم ہوا۔ پچھتر ہزار روپیہ کے صرف سے پل تعمیر ہوا جس کی با بجائی خزانہ عامرہ سے کئی گنتی۔ کسی وقت یہاں سنگ سیاہ کی تختی پر حیدر آباد کے شاعر مرزا غائب طور کی کہی ہوئی تاریخ بنائے پل کندہ اور نصب تھی۔ لیکن اب یہ کتبہ یہاں نہیں ہے۔

ناصر الدولہ شاہ آصف جاہ
کہ عدیش کسے نہ دید نگاه
حکم چوں شد براجمہ چندو لعل
زور زد پل بہ شام و پگاه
از سر عقل میسر استورٹ
پل بنا کر دیشل مہر و مساہ

مادہ تاریخ اس طرح ہے :- پل بنا کر دیشل مہر و مساہ = ۱۱۷۶

ع: ۵۱۲۶۶

یکم رمضان ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) کی طغیانی میں اس پل کو سخت نقصان پہنچا۔ پھر دو کمانوں کے مابقی تمام کمانیں ٹوٹ گئیں۔ سنہ ۱۳۲۸ھ اس پل کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ فٹ پاتھ اود لوہے کا کھڑا بنایا گیا۔ اس جدید تعمیر کا خرچہ دو لاکھ چالیس ہزار ایک سو دس روپیہ خزانہ عامرہ سے ادا ہوا۔

افضل گنج پل

نظام پنجم اعظمیت منفرت مسکان لوب میر تنہیت علی خاں افضل اللہ
بہادر سنہ ۱۲۷۳ھ میں تخت نشین ہوئے تخت نشینی کے دو سال بعد
سنہ ۱۲۷۵ھ افضل گنج پل کی بنیاد پڑی رد سوئی پر یہ تعمیر ہوئی ہے

تاریخ و ادب
جو چادر گھاٹ پُل کی تعمیر کے تیس سال بعد بنا۔ یہ پُل ۱۱۱ کمانوں پر
تاسم ہے۔ پُل کی تعمیر کے ساتھ شمالاً اور جنوباً در خوبصورت دروازے
تعمیر کئے گئے۔ شمال کی سمت کا دروازہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی میں منہدم
ہو گیا۔ جب پُل تعمیر ہوا تو اس وقت ریاست کے دیوان لڑاب سلاہ جنگ
بہادر اول تھے اور ریڈنٹ کرنل ڈیوڈ سن۔ ایک انگریز سڑمارٹ کی زیر
نگرانی اس پُل کی تکمیل ہوئی۔ تکمیل پُل کی تاریخ فرسودہ وجہہ للہ خان
معنی (شاگرد حضرت فیض) سنگ مرمر پر کندہ دروازہ کی سیدھی جانب نصب تھی۔

بعد افضل الدولہ بہادر

نظام الملک آصف حیاہ دوران

الہی تابود تباباں مہ و مہر

بود خورشید اقبالش در خشاں

نکو دیوان اد محنت را الملک است

کہ نیکی را بود ہر حال خواہاں!

بود کرنیل ڈیوڈ سن بہادر

سفیر نیک دل ذی شوکت و شان

رحمن رائے سڑمارٹ این پل!

بنا شد ہم چون طاق ہفت ایوان

صراط مستقیم رود موسیٰ

ز معنی مصرعہ تاریخ بر خوان

”صراط مستقیم رود موسیٰ“ تاریخ تکمیل پُل ہے۔

یہ پُل افضل گنج بس اسٹانڈ سے شروع ہو کر جنوب میں پتھر گٹھی
کے ابتدائی سرے پر ختم ہوتا ہے۔ اس پُل کے خوب صورت دروازہ
پر آعلحضرت غفران مکان لڑاب میر محبوب علی خاں بہادر کی چیل
سالہ جو پُل کی یادگار میں ایک بڑی گھڑی نصب کی گئی تھی۔

۲۲ شوال ۱۳۲۳ھ [۲۳ دسمبر ۱۹۰۵ء] حسبِ پروگرام اعلیٰ حضرت
غفران مکان نے حضرت بابا شرف الدین کی بیہوشی سے جلوس کے
ساتھ خاصہ کی بجھی میں سوار باغ عام جاتے ہوئے مغرب کے وقت
اس گھنٹہ گھر کا افتتاح فرمایا تھا ۱۹۰۸ء کی تباہ کن طغیانی میں اس کی
چند کمانیں ٹوٹ گئیں تھیں۔ اور پُل کو سخت نقصان پہنچا۔ از سر نو اس کی
تعمیر ہوئی۔ فٹ پاتھ بنائے گئے اور آہنی کھڑکی کے دونوں طرف
لگایا گیا۔ پولیس ایکشن ۱۹۲۸ء کے بعد آمد و رفت کی سہولت کے پیش
نظر اس پل کی توسیع عمل میں آئی اور ٹرافک کی خاطر خوب صورت دروازہ
زمین دوز کر دیا گیا۔

آعلیٰ حضرت خلد مکان لواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع
کے عہد زرین میں اس پل کے شمال میں ایک طرف کتاب خانہ آصفیہ،
(اسٹیٹ لائبریری) اور دوا خانہ عثمانیہ اور جنوبی سمت عدالت العالیہ اور
سٹی کالج جیسی عظیم الشان خوب صورت عمارتیں تعمیر ہوئی۔ اسی عہد میں رود
موسیٰ کے شمالی کنارے ان بلند بالا عمارتوں کے آگے وسیع خوشنما چمن دکش
حوض اور فواروں سے آراستہ تعمیر ہوئے۔ آج بھی یہ چمن عوام کے لیے
فرحت بخش تفریح گاہ ہے۔ افضل گنج پُل کو نیا پُل بھی کہتے ہیں۔ اس
لیے یہ چمن نئے پُل کے چمن سے مشہور ہے۔ چنانچہ استاد سخن صفی اورنگ
اپنے ایک شعر میں اس چمن سے وابستہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے
ہیں۔

صفی اپنے پرانے واقعہ پر
مئے پُل کا چمن یاد آگیا ہے
لیکن آج یہ چمن زبان حال سے اس طرح گویا ہے۔
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصل بہاروں
ٹھیک پی تو ہے۔ چمن اُڑ گیا آمدِ صیال آتے آتے

مسلم جنگ پل

مسلم جنگ پل رود موسیٰ پر پڑائے پل اور افضل گنج پل کے درمیان واقع ہے۔ شمالاً بیگم بازار سے شروع ہو کر جنوباً پٹیلہ برج کے ابتدائی کنارے پر ختم ہوتا ہے۔ جنوبی سمت ایک قدیم دروازہ چمپا دروازہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس لیے اس پل کو چمپا دروازہ کا پل بھی کہا جاتا تھا۔ لڑاں مسلم جنگ نے رفاہ عام کی خاطر اس پل کی تعمیر اپنے مرقہ سے کی تھی۔ اس لیے ان کے نام سے مسلم جنگ پل مشہور ہوا۔ مسلم جنگ سالم علی جمعیار عرب کا خطاب تھا۔ جن کا شمار ذی مرتبتہ جاگیردار اور جمعیہ اراکین میں ہوتا تھا۔ لڑاں افضل الدولہ بہادر نے انھیں یہ خطاب عطا کیا تھا اور آکھڑ غفران مسکان نواب میر محمد علی بہادر نے ان کو غالب جنگ غالب الملک اور لائق الدولہ کے خطابات سرفراز کئے تھے۔ انھیں شکار اور سفر شاہانہ میں آعلیٰ حضرت غفران مسکان کی ہمراہی کا شرف ہمیشہ حاصل رہا۔ ۸ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ بمطابق ۱۸۰۲ء میں لڑاں مسلم جنگ کا انتقال ہوا۔

صرف یہی پل ایسا ہے کہ آج بھی پل کے جنوب مغربی سمت تاریخ آغا تیاری پل سنگ مرمر کی تختی پر کندہ ہے (۹ ذی الحجہ ۱۲۳۱ھ) اور سنگ سیاہ پر تاریخ تکمیل پل بلہر شوال ۱۲۳۱ھ اُبھرے ہوئے حروف میں موجود ہے۔ اس طرح چادر گھاٹ پل کی تعمیر کے بہتر (۲۲) سال اور افضل گنج پل کے پچیس (۲۲) سال بعد مسلم جنگ پل تعمیر ہوا۔ تکمیل پل کے بعد اس کا افتتاح اعلیٰ حضرت غفران مسکان نے ۱۵ محرم ۱۲۳۱ھ کو بنفس نفیس پل پر رونق افروز ہو کر کیا تھا۔

سید عبدالقادر دہلوی کوٹ کے ایک وکیل تھے۔ وہ شاعر بھی تھے

اور تخلص قانع تھا۔ آخر میں نواب مسلم جنگ کے تمام کارخانہ جات و جاگیرات کے معتمد مقرر ہوئے۔ نواب مسلم جنگ کے ہمراہ لندن کی سیاحت بھی کی تھی۔ پُل کے اختتام پر سنگ مرمر کے کتبہ پر ان ہی قانع کی کہی ہوئی تاریخ کندہ ہے

عہد میں حضرت آصف کے بنا
غالب الملک کا پُل سوکھی پر
اس کی تاریخ بھی قانع نے
واہ کیا خوب عمارت بہتر

”عمارت بہتر“ سنہ ۱۳۱۸ھ مادہ تاریخ تکمیل پُل ہے۔

۱۹۰۸ء کی طغیانی میں اس کی سات کمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔

طغیانی کے بعد جب جدید تعمیر ہوئی تو مزید دو کمانوں کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہ پُل دس کمانوں پر قائم ہے۔

مکہ مسجد میں آصف جاہی قبور

مکہ مسجد حیدر آباد دکن کی ایک عظیم الشان تاریخی مسجد ہے جس کے صحن میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک سنگ بستہ شان دار مقبرہ ہے۔ اس سلسلہ وار شاہان آصفیہ کی قبریں ہیں اس کے علاوہ مسجد کے وسیع و عریض احاطہ میں محلات شاہی کی قبریں واقع ہیں۔ مورخین نے ان کے نام مع تاریخ وفات تو بتائے ہیں لیکن کس کی قبر کہاں بنی ہے اس کی نشان دہی سے قاصر رہے ہیں۔ تعجب اور افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ نظامت احمد مذہبی صرف غاص میں بھی جس کے زیرِ اہتمام ان مرحومین کا سالانہ فاتحہ اور ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے یہ تفصیلات ندرت ہیں۔ تمام لوگ جو مکہ مسجد آتے جاتے رہتے ہیں وہ ان قبروں کی اہمیت و حرمت کیا جان سکتے ہیں۔

راقم السطور جن دنوں "سوانح عمری صفی اور نگ آبادی" کی تالیف کے سلسلہ میں مرحوم حضرت ابوالنصر محمد خالدي صاحب سابق استاد تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں جایا کرتا تھا مذہب، تاریخ، شعر و ادب کی بہت سی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ حیدر آباد دکن ان کا وطن تھا اور شاہی دور دیکھا تھا اس لیے بھی انھیں آصف جاہی دور سے بڑی دلچسپی تھی۔ بڑی محققانہ نظر رکھتے تھے۔ تاریخ کی گم شدہ اور فراموش کردہ یادگاروں کی نشان دہی اس وثوق اور والہانہ انداز سے کرتے تھے کہ سننے والوں کے اندر تحقیق و تجسس کا داعیہ ایک شعلہ کی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اٹلتے گفتگو احاطہ مکہ مسجد کے شمال و جنوب میں ادھر ادھر بنی ہوئی خانوادہ آصف جاہی کے قبور کا ذکر آگیا تو نام بنام کسی کی قبر کہاں بنی ہے اس کا انکشاف کرتے ہوئے مجھ سے مزید تحقیق کرنے کو فرمایا۔ بات آتی گئی ہو گئی دیکھتے دیکھتے اس پر چھ سال گزر گئے ہیں اگرچہ دوسری مفروضات میں الجھا رہا، لیکن بار بار دل میں یہ خیال آتا رہا کہ مولانا خالدي کی نشان دہی کی روشنی میں آگے قدم بڑھانا چاہیے کہ مرد زمانہ سے اگر ان قبروں کے نشان میٹ بھی گئے تو کم از کم صفحہ قرطاس پر تو محفوظ رہ سکیں گے۔

مکہ مسجد کی شمالی سمت میں

مکہ مسجد میں داخل ہوتے ہی جانب شمال حضرت زینب النساء بیگم صاحبہؓ ایک قدیم پُرانی وضع کا مگر خوبصورت گچ کا مقبرہ نمایاں ہے۔ مقبرہ کے درمیان گچ کا بنی ہوئی رناتی قبر حضرت زینب النساء بیگم صاحبہ محل اولى لواب نظام علی خاں آصف شاہ ثانی کی ہے جو صوبہ دار برہان پور خود جسم ملی خاں کی چھوٹی صاحبزادی تھیں جناب سراج الدین طالب اپنی تالیف "نظام علی خاں" جلد دوم میں رقم طراز ہیں:

”مراسم عقد کے بعد محلات میں داخل ہوئیں۔ ان کو بندگان عالی نے
 ”برہان پوری بیگم“ کا خطاب عنایت فرمایا تھا (ص ۶۶) صاحب ”یادگار
 مکھن لال“ نے زینب النساء بیگم صاحبہ کا سنہ وفات ۶ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ
 لکھا ہے۔ شاہ کٹر حیدر آبادی لؤاب نظام علی خاں کے عہد میں موجود تھے انہوں
 نے لؤاب نظام علی خاں کی خادمہ ”واسوسن“ کی فرمائش پر مثنوی ”داستان
 نظام علی خاں“ لکھی تھی۔ صاحبزادہ ڈاکٹر نجم الدین علی خاں نے سنہ ۱۹۷۸ء
 میں اس مثنوی کے مخطوط کو مطبوعہ کے سراجی میں داخل کیا۔ یہ مثنوی ایک
 مستند تاریخی ماخذ ہے۔ شاہ کٹر نے حضرت زینب النساء بیگم صاحبہ سے
 لؤاب نظام علی خاں کی شادی کا ذکر لیا ہے :

وہ خود جم علی خان بڑا تھا اسیر

بہادر شجاع اور دانا کیسیر

وہ بیٹی تھی چھوٹی پری کے مثال

نیٹ خوب صورت ، و صاحب کمال

وہ زینب النساء بیگم خوب رو

بنی وہ تو مثل پری ہو بہ ہو

رکھے ان سے لؤاب عشرت کے کام

برہان پوری بیگم رکھے اس کا نام

مقبورہ زینب النساء بیگم صاحبہ سے ذرا آگے بجانب

خجستہ بالو بیگم | مغرب وسیع چوتھ پر سنگ سیاہ کی پہلی زنانی
 قبر آصف جاہ اول کی صاحبزادی اور لؤاب نظام علی خاں کی خواہر خجستہ بالو بیگم
 صاحبہ کی ہے ”مقدمہ تاریخ دکن“ مولف عبدالمجید صدیقی صاحب میں خجستہ بالو بیگم
 صاحبہ کو آصف جاہ اول کی صاحبزادی بتایا ہے (ص ۹۹) لیکن مورخین نے
 مکہ مسجد میں مدفون اس شہزادی کا نام خجستہ بالو بیگم کی بجائے ”خال بہادر بیگم“
 ہی لکھا ہے۔ ”صومت عثمانیہ“ میں قاضی اسر اللہ قندھاری صاحب کا بیان

ہے کہ یہ حضور نظام علی خاں کی ہشویں تھیں۔ آپ کی مردانہ طبیعت تھی کبھی زندہ بکتر پہن کر گھوڑے کی سواری کیا کرتے تھیں“ (صفحہ ۹)

ممکن ہے اپنی اس مردانی وضع کے سبب وہ اس نام سے مشہور ہوئی ہوں۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں فرامین مبارک بائبل سنہ ۱۳۳۵ء جلد (۱۲) میں ایک درخواست برائے ہجرت بمقابلہ موٹری مافیا متعینہ ہوئے عجمتہ بالو بیگم واقع مکتہ مسجد موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عجمتہ بالو بیگم ہی اصل نام ہے مگر اب تو نہ مقبرہ ہے نہ چوکھٹلی۔

عجمتہ بالو بیگم صاحبہ کی قبر سے کچھ فاصلہ پر مغربی جانب امامی بیگم | امامی بیگم صاحبہ دختر لڑاب نظام علی خاں کی قبر ہے۔ قبر پر بھی چوکھٹلی تھی جو اب نہیں ہے۔ قبر پر کچی کٹی ہوئی ہے۔ امامی بیگم کا نام بحیثیت دختر لڑاب نظام علی خاں اور مکتہ مسجد میں ان کی تدفین ہونے کا حوالہ کتب توارخ اور مورخین کے مضامین میں ملتا ہے ملاحظہ ہر ملاحظہ ثانی اور آثار دکن۔

مکتہ مسجد میں جنوبی جانب گچے کا بنایا ہوا ایک مطیل مقبرہ نظر آتا ہے جن کے شمالاً جنوباً دروازے لگے ہوئے ہیں اور مقبرہ کی چاروں دیواروں میں خوبصورت جالیاں لگی ہوئی ہیں اور چھت کے اوپر چھوٹے آٹھ مینار نمایاں ہیں۔ مقبرہ میں فرش سنگ سیلو کا ہے جب کہ درمیان میں سفید سنگ مرمر کی بنی خوبصورت پانچ زبانی قبری موجود ہیں ان قبروں پر کوئی لوح قرار نہیں ہے لیکن جن کی قبریں ہیں ان کے نام اور تاریخ وفات حسب ذیل ہیں :-

حضرت تہنیت النساء بیگم صاحبہ :

مقبورہ میں انتہائی مغرب میں سہی قبر حضرت تہنیت النساء بیگم صاحبہ

عرف بنی بای صاحبہ محل لڑا ب نظام علی خاں اور حقیقی والدہ لڑا ب سکندر جاہ کی ہے۔ تاریخ رشید الدین خانی میں لکھا ہے کہ ”اسی سال (۱۲۳۷ھ) تیسویں جمادی الاخریٰ میں تنہیت النساء بیگم صاحبہ حقیقی والدہ لڑا ب سکندر جاہ داخل بہشت بریں ہوئیں۔ (۳۳۹)

اس سلسلہ کی دوسری قبر حضرت

حضرت فضیلت النساء بیگم صاحبہ | فضیلت النساء بیگم صاحبہ کا ہے

جن کا نام چاندنی بیگم اور خدیجہ بیگم بھی تھا۔ حضرت فضیلت النساء بیگم صاحبہ لڑا ب سکندر جاہ کی محل اور نولب نامہ الدولہ کی حقیقی والدہ تھیں۔ صاحب رشید الدین خانی نے بتایا ہے کہ آٹھویں ربیع الاول سنہ ۱۲۴۹ھ بارسو انجاس میں فضیلت النساء بیگم صاحبہ مکرمہ حقیقی والدہ ماجدہ حضرت عالی راہی عالم بقا ہوئیں۔ (۳۴۰)

حضرت بخش بیگم صاحبہ | حضرت بخش بیگم صاحبہ لڑا ب نظام علی خاں کی محل تھیں شاہ کتر نے بخش بیگم صاحبہ

کی مدح میں لول لکھا ہے:

جو بیگم ہے ان کی پری کے مثال

سو وہ بخش بیگم ہے صاحبہ جمال

سوزن زرینہ سے صب بیگمات

خصوصاً وہ بیگم جو ہے نیک ذات

سو وہ بخش بیگم بڑی سان کے

نہٹ خوبصورت بہت شان کے

مروجہ تاریخ رشید الدین خانی ”سنہ ۱۲۴۸ھ بارسو اٹھائیس تاریخ ذی الحجہ کی

بخش بیگم صاحبہ بڑی والدہ حضور کی تشریف فرمائے روضہ جاودانی ہوئی

(۳۴۱) انتقال کے وقت عمر تتر سال تھی۔ صاحب نگار مہستان اصلی

لکھتے ہیں ”بوقت انتقال وصیت کی کہ انھیں پاتین لڑا ب نظام علیخان

رفق کیا جائے۔ اسی وصیت پر عمل کیا گیا“ (ترجمہ فارسی ص ۱۹)

تاریخ و ادب
بخشی بیگم صاحبہ کی پہلی قبر ہے جو اس مقبرہ میں بنی۔ سنہ وفات سے یہ ظاہر
اور واضح ہے۔

حضرت دلاور النساء بیگم صاحبہ | بجانب مشرق حضرت دلاور انسا بیگم

کا مدفن ہے۔ حضرت دلاور النساء بیگم صاحبہ لواب نام الدولہ کی محل
لواب افضل الدولہ کی حقیقی والدہ مکرمہ اور غفران مکان لواب میر محبوب علی
کی مدد محترمہ تھیں ستر سال کی عمر میں (۱۳۰۵ھ) (تیرہ سو پانچ)
راہی ملک کلام ہوئیں۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان لواب میر محبوب علی خاں کی
کسمی میں ان کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں دلاور النساء بیگم صاحبہ کا
خاصہ حصہ رہا اور جب وہ تخت لکھن ہوئے تو انتظامی امور سلطنت
میں رہنمائی کی۔

تمام تاریخوں میں آتا ہے کہ بڑی نیک دل، صاحب خیر اور عابدہ و زاہدہ
فاتون تھیں کئی مکانات تمام آرام و سائش سے آراستہ حرمین شریفین
(زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً) میں وقف کئے تھے۔ چنانچہ آپ کی تعمیر کردہ
تین منزله رباط مکہ منظر میں حرم سے بہت قریب سنہ ۱۹۸۰ء تک موجود
تھی۔ رباط کے باب الداخلہ پر چکنے پتھر کی تختی چسپاں تھی جس پر سوٹے
سیاہ حروف میں ”رباط دلاور النساء بیگم“ کندہ تھا اور سنہ تعمیر ۱۲۹۳ھ
(بارہ سو ترانوہجری) بھی لکھا ہوا تھا۔ رباط بوسیدہ ہو جانے سے اسے
منہدم کر کے اس جگہ لواب مکرم جاہ بہادر نے سنہ ۱۹۸۱ء میں دو منزله
رباط ”رباط حیدر آباد“ کے نام سے تعمیر فرمائی۔ حاجیوں اور زائرین
کو مفت ٹھہرنے اور ہر ممکن آرام و سہولت پہنچانے کی حضرت دلاور انسا بیگم
صاحبہ جیسی صاحب خیر ملک کی روایت آج بھی ”رباط حیدر آباد“ میں اور بہتر
سے بہتر طور سے جاری و برقرار ہے جو دلاور النساء بیگم صاحبہ مرحومہ جیسی
نیک دل ملک و کن کی یاد دلاتی ہے۔ قدیم سے آج بھی ہر سال باقاعدہ

حضرت دلاور النساء بیگم صاحبہ کے مزار پر فاتحہ خوانی ہوتی ہے عرس ہوتا ہے اور چادر گل چڑھائی جاتی ہے۔

جناب خالدی صاحب کی نشان دہی
حضرت واحد النساء بیگم صاحبہ کے بموجب اس مقبرہ کی آخری مشرقی سمت کی قبر حضرت واحد النساء بیگم صاحبہ کی ہے جن کا انتقال ۱۰ شعبان سنہ ۱۳۳۷ھ یکشنبہ درمیانی شب میں ہوا۔ صبح پانچ بجے مکہ مسجد میں تدفین ہوئی۔ واحد النساء بیگم صاحبہ اعلیٰ حضرت مغفرت مکان لواب افضل الدولہ کی محل، اعلیٰ حضرت غفران مکان لواب میر محبوب علیخان کی حقیقی والدہ اور اعلیٰ حضرت لواب میر عثمان علی خاں کی جدہ محترمہ تھیں۔

جنوبی سمت کی چھ قبور

جنوبی مقبرہ کے باہر اس کی مشرقی دیوار سے ملحق ایک فٹ اونچے سنگ سیلو کے چوتھرہ پر سلسلہ وار ایک وضع کی چھ سنگ مرمر کی زنانی قبریں بغیر کسی سایہ بان نظر آتی ہیں۔ یہ مسجد کی صرف یہی قبریں شاہی بیگمات اور شاہزادوں کی ہیں جن کی قبر کی تعویذ کے سرہانے سنگ مرمر کی چھوٹی سی تختی پر نام اور پائین کی تختی پر سنہ وفات اور رشتہ قرابت کندہ ہے قبروں کی ترتیب مغرب سے مشرق کی سمت حسب ذیل ہے :

- (۱) حضرت اُجالا بیگم صاحبہ محل غفران مکان علیہ رحمۃ تاریخ وفات ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء (۲) حضرت سردار بیگم صاحبہ محل حضرت غفران مکان تاریخ وفات ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء (۳) غوث النساء بیگم صاحبہ۔ حاجزادی مرحوم سرکار محل فرید نواز جنگ فرزند سلطان الملک مرحوم تاریخ وفات ۳ نومبر ۱۹۵۵ء (۴) داور النساء بیگم صاحبہ حاجزادی مرحوم سرکار۔ محل مذیر نواز جنگ فرزند سلطان الملک مرحوم تاریخ وفات ۱۱ جون ۱۹۶۱ء (۵) آصف النساء بیگم صاحبہ حاجزادی مرحوم سرکار محل مظفر نواز جنگ مرحوم تاریخ وفات ۲۶ دسمبر ۱۹۶۵ء۔ ۶۔ عہدہ بیگم محل غفران مکان تاریخ وفات یکم جون ۱۹۶۹ء

لؤاب میر محبوب علی خاں کی یہ محل تھیں جن کا انتقال حضور نظام لؤاب میر عثمان علی خاں کی وفات (۱۹۶۷ء) کے دو سال بعد ہوا۔

جنوبی سمت کی آخری دو قبریں

مذکورہ چوتھے کے پائین میں دو قبریں ایک دوسرے سے ذرا فاصلہ پر بنی ہوئی ہیں جن پر کوئی کتبہ نہیں۔ ان پر چوکھنڈی بنی ہوئی ہونے کا حالہ کتب تاریخ میں ملتا ہے۔

لواسوسن | سنگ سیاہ کی زنانہ قبر ”لوبو“ لؤاب نظام علی خاں کی ہے لوبو خادمہ تھی شاہ کمر نے اس خاتون کی فرمائش اور امید انعام میں شنوئی دستاں نظام علی خاں ”میں لکھی تھی چنانچہ لوبو سوسن کی تعریف میں کمرلوں رطب اللسان ہیں:

جو ہے لوبو سوسن وہ صاحب تمبیر!

وہ ہو شیار و دانا دہر دل عزیز

نظام علی خاں لوبو تھی جان نثار

وہ لؤاب بھی اس لوبو رکھتے تھے پیار

مبارک اسے لوبو سوسن ہے نام!

محبت سے ان کا کرتی تھی کام!

میائ نیک روز خان | لوبو سوسن کی قبر کے مشرقی جانب میائ نیک روز خان خواجہ سر لؤاب نظام علی خاں کی قبر

ہے۔ میائ نیک روز خاں کے مکہ مسجد میں دفن ہونے کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ دکن کے مورخ و محقق جناب مبین الدین رہبر صاحب دق نے اپنے محققانہ مضمون ”مکہ مسجد کی تاریخی عظمت“ (۱ سب رس ستمبر ۱۹۶۷ء)

میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ صاحب "صولت عثمانی" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے
 "ان کی قبر پائین فرشتا ہے۔ یہ ثواب نظام علی خاں کا خواجہ سرا اور حضور مدح
 کا مولود غایت تھا" [بصفت]

خاندانہ آصفیہ کے اس شاہی قبرستان میں جہاں شاہان آصفیہ، ان کے
 محلات اور شہزادے شہزادیاں آسودہ خواب میں وہاں ان کے بعض خدام کی قبروں
 کو دیکھ کر یہ تاثر پیدا سوتا ہے کہ ان بادشاہوں نے ملازمین بارگاہ کے فیادار
 خدمات امدان کی جان نثاری کی اس درجہ قدر کی کہ مرنے کے بعد بھی ان کی رفا
 کو یوں ملحوظ رکھا کہ آج ان کی قبروں کے برابر ان نیک خواروں کی قبریں بنی ہوئی
 ہیں۔

ان مرحومین کے سالانہ ایصالِ ثواب کا منجانب پرائیوٹ اسٹیٹ حضور نظام
 (ضیغہ امور مذہبی) اہتمام کیا جاتا ہے تو اب یہ بہت فرضی ہے کہ ان شاہی
 قبروں کی کما حقہ حفاظت و نگہداشت کا بھی انتظام ہو۔
 آخر میں دودمان آصفی کے چشم و چراغ اعلیٰ حضرت حضور ثواب مکرم جاہ
 بہادر آصف جاہ ثامن اور شہزادہ ثواب مفتاح جاہ بہادر کی خدمت میں بڑے
 ادب سے معروضہ کرتا ہوں کہ ان تمام قبروں پر گوت مزار کی تنصیب کا حکم فرمائی
 تاکہ صاحب مزار کے متعلق کوئی جاننا چاہے تو ان کا نام سنہ وفات و غیب کا
 تفصیلات معلوم ہوں۔

مکہ مسجد میں مقبرہ سلاطین آصفیہ

سرزمین ہندوستان میں بادشاہوں کے مقبرے اور گنبد جگہ جگہ موجود اور
 نمایاں ہیں۔ سلاطین مغلیہ کے خوبصورت گنبد شہر دہلی، آگرہ اور لاہور کی
 زمینت بنے ہوئے ہیں۔ دکن میں سلاطین بہمنیہ، برید شاہیہ، عادل شاہیہ اور
 قطب شاہیہ کے بلند سے بلند تر عجیب الشان گنبد گلبرگ، بیدر، بیجا پور اور

گو کنگدہ میں سیاحوں کے لیے وجہ کشش ہیں۔ جیسا کہ اس زمانہ میں رواج تھا ان بادشاہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے اپنے گنبد تعمیر کرائے لیکن غور طلب بات ہے کہ سلاطین آصفیہ نے دکن میں تقریباً دو سو سال بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کی مگر ان میں سے کسی بادشاہ یا ان کے جانشین نے اپنے نئے کوئی گنبد تعمیر نہیں کیا۔ اس کی وجہ ہم غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ بادشاہ دولت و جاہ و اقتدار میں کتنا ہی بلند مقام رکھتے ہوں لیکن فطرتاً بڑے فقیر بخش تھے اور جانتے تھے کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ کے اس دنیا سے جانا ہے۔ انھوں نے یہاں اپنی زندگی میں کسی کسی عالی شان حویلیاں بنوائیں بڑے بڑے خوب صورت جنت نشان محل تعمیر کئے۔ چاہتے تو کسی وسیع و عریض خطہ پر اپنے لیے عالی شان و بے مثال گنبد بناتے جو فن تعمیر کا حسین ترین رقعہ ہوتے لیکن انھوں نے اپنی آخری آرام گاہ کے لیے مسجد کا انتخاب کیا کہ کوئی اللہ کا نمازی بندہ ان کی یہ بیکی دیکھ کر کہے:

کل جور رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج !

آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج !

اللہ کے حضور ان کے لیے دعائے مغفرت تو کرے گا۔

حکومت آصفیہ کے پہلے حکمران نواب آصف جاہ اول کا مزار قلعہ آباد (اورنگ آباد) میں درگاہ حضرت برہان الدین غریب کے مغربی جانب ہے جس پر کوئی گنبد نہیں البتہ سرخ سنگ مرمر کی چو کھنڈی بنی ہوئی ہے اور نام کا کتبہ بھی موجود ہے۔ اس طرح خاندانہ آصفیہ کے دوسرے بادشاہ نواب ناصر جنگ شہید (میر احمد خاں) کا مزار بھی اسی درگاہ کے جنوب میں واقع ہے جس پر چو کھنڈی بھی ہے اور کتبہ بھی۔ نواب مظفر جنگ (ہدایت محمدی الدین) تیسرے بادشاہ نواب آصف جاہ اول کے نواسے تھے جو صرف درمہا تخت آصفیہ پر متمکن رہے اور ان کے قتل ہونے کے بعد تاریخ بس اتنی رہبری کرتی ہے کہ ان کے اقربا ان کا جنازہ بیجا پور کی طرف لے گئے۔

لیکن ان کی قبر کہاں ہے اس کا حوالہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ مغفرت مآب لواب آصف جاہ اول کے فرزند میر محمد خاں صلابت جنگ سلسلہ آصفیہ کے چچ تھے۔ بادشاہ تھے۔ انھوں نے مملکت آصفیہ پر ۱۱۳۱ سال حکومت کی آخر کار ان کے بھائی غفران مآب لواب نظام علی خاں نے ان کو معزول کر کے قلعہ بیدر میں قید کر دیا۔ انتقال کے بعد ان کی تدفین بیدر میں حضرت شمس الدین ^{ملتان} کی درگاہ کے جوار میں ہوئی۔ یہ بڑی عبرت کا مقام ہے کہ لواب صلابت جنگ کی قبر بڑی گنگام حالت میں ہے جس پر نہ گنبد ہے نہ چوکھنڈی اور نہ کوئی کتبہ۔

آخری بادشاہ دکن اعلیٰ حضرت لواب میر عثمان علی خاں کی آخری آرامگاہ ان کی وصیت کے مطابق مسجد جودی و محاذی گنگ کوٹھی میں ان کی والدہ مرحومہ کے پہلو میں بنی۔ قبر پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہے۔ سقوط حیدر آباد سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد حضور نظام کو تخت و حکومت سے دست بردار ہونا پڑا تھا اور وہ بادشاہ نہیں رہے تھے۔ اس لئے آپ نے مکہ مسجد کے شاہی مقبرہ میں شاہان سلف کی صف اپنی تدفین مناسب نہیں سمجھی۔ النہی سلسلہ آصفیہ کے محدودے چند حکمرانوں کے سوا جن کی قبریں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں پانچ بادشاہ اسی ایک سنگ بستہ شاہی مقبرہ میں پہلو بہ پہلو ابدی نندیدہ سو رہے ہیں۔

جب غفران مآب لواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی والدہ محترمہ حضرت عہد بیگم صاحبہ کا انتقال سنہ ۱۱۸۸ھ میں بمقام حیدر آباد ہوا تو ان کی تدفین مکہ مسجد میں اسی جگہ ہوئی جہاں یہ مقبرہ بنا ہوا ہے خاتواں آصفیہ کی یہ پہلی خاتون تھیں جن کی تدفین سب سے پہلے مکہ مسجد میں ہوئی ان کے بعد ہی سلاطین آصفیہ ان کی بعض بیگمات، شہزادوں، اور شہزادیوں کی تدفین یہاں ہونے لگی چنانچہ مکہ مسجد میں شمالاً اور جنوباً شاہی افراد خاندان کی قبریں موجود ہیں۔

متذکرہ مقبرہ سلاطین کی تعمیر سے قبل ان قبروں پر سنگ مرمر کی خوبصورت چوکھنڈیاں ماہر کاریگروں کی بنائی ہوئی تھیں جن کے اطراف سنگ مرمر کی جالیوں نقش و نگار سے آراستہ، گل بوٹوں سے پیراستہ فن سنگ تراشی کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ بادشاہوں کے مقبروں پر نام اور تاریخ وفات کے کتبے بڑے دیدہ زیب اور نفیس خط میں کندہ تھے قبروں کے اوپر کوئی عمارت نہ تھی صرف سولہری کے ادبچے اور گھنے درخت ان پر سایہ لگن رہتے تھے۔ جب اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں سربراہ آلے سلطنت ہوئے تو رفاہی اور تعمیری کاموں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ مکہ مسجد میں قبور سلاطین پر مقبرہ تعمیر کرنے ۲۲ جمادی الاول ۱۲۳۲ھ حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں مکہ مسجد کے شایان شان تراشیدہ پتھر کے اس مقبرہ کی تعمیر اس خوبی سے ہوئی کہ یہ بھی گویا مکہ مسجد ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے جو عہد قطب شاہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ جب یہ مقبرہ تعمیر ہونے لگا تو شاہی قبور سے سنگ مرمر کی چوکھنڈیاں اور کتبے نکال دیئے گئے اور ایک فٹ اونچا سفید سنگ مرمر کا مستطیل چوترہ تعمیر کیا گیا جس پر قطار اندر قطار مغرب سے مشرق سنگ مرمر کی قبریں بنی ہوئی ہیں جن پر گل کاری کی گئی ہے لیکن کسی قبر پر نام کا کتبہ نہ ہونے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس کی قبر ہے۔ البتہ ہر جمعہ کو قبروں پر زرد رنگ کا غلاف ڈالا جاتا ہے اور ایک فریم میں نام اور تاریخ وفات لکھی ہوئی موجود رہتی ہے نام کا کتبہ نہ ہونے سے عوام تو کجا خود تاریخ نگاروں نے نشان دہی کرنے میں سخت غلطیاں کی ہیں۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کی تدفین ان کے دادا اعلیٰ حضرت غفران منزل نواب ناصر الدولہ کے پہلو میں ہوئی لیکن صاحب بستان آصفیہ نے جلد پنجم

لے آثار ضامدین صفحہ سید ہالید مذاہیر شریہ فرمان فائز قسط (۸۰) میلہ نشان (۲۲۴) کہ (۱۳۰۲) آمد ہر پٹی ایٹ آرکائیو۔

۲۹۹، سٹریڈراج نے اپنی تالیف ”یکٹوریل حیدر آباد“ جلد اول ص ۸۲ اور مملکت آصفیہ“ جلد اول ص ۱۶۸ (مطبوعہ پاکستان) میں ان کی تدفین ان کے والد اعلیٰ حضرت مغفرت مکان لواب افضل الدولہ کے پہلو میں بتائی ہے حالانکہ محققین کے مضامین کی روشنی میں یہ صحیح نہیں ہے اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ دفتر ناظم امور مذہبی صحت خاص ٹرسٹ سیچ۔ دی۔ سیچ دی نظام کی جانب سے جس کے ذمہ اس مقبرہ کی صفائی و نگرانی ہے ان مرادوں پر ناموں کے کتبے لگائے جائیں۔

آئیے اب اس مقبرہ شاہی کو دیکھیں :

اعلیٰ حضرت مغفرت مکان
لواب افضل الدولہ بہادر

سلاطین کے اس مقبرہ میں انتہائی مغرب پیل
قبر لواب میر تہنیت علی خان لواب افضل الدولہ
مغفرت مکان کی ہے۔ لواب افضل الدولہ

۲۹ ربیع الآخریٰ سنہ ۱۲۴۲ھ ”حویلی قدیم“ حیدر آباد دکن میں تولد ہوئے اور اپنے والد لواب ناصر الدولہ کی وفات کے بعد ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۴۳ھ [۱۸۵۷ء] تخت نشین ہوئے۔ بارہ سال ایک ماہ بیس دن حکومت کرنے کے بعد سات دن بیمار رہ کر جمعہ ۱۳ رذیقعدہ سنہ ۱۲۴۵ھ (۲۶ فروری ۱۸۶۹ء) بعمر بیالیس سال راہی ملک بقا ہوئے۔ ہر جمعہ قبر پر رکھے جانے والے فریم میں تاریخ وفات ۱۲ رذیقعدہ درج ہے جو قابل اصلاح ہے۔ لواب افضل الدولہ کے مقبرہ پر جناب علی عباس ادیب چیریا کوٹی کی کچی ہوئی تاریخ وفات کندہ تھی :

ابی الماک ماح الجنة و الحمد و حی فاح الجنة

قلت تاریخ وفات المرحوم افضل الدولہ راح الجنة

۱۲۸۵ھ

(صوت عثمانی ص ۵۷)

لواب افضل الدولہ بہت بیک دل اور صاحب خیر بادشاہ تھے۔ رعایا کی سبقتی کے لیے کئی حکام کلام کئے۔ روانہ تھے۔ پل، سرائیں اور مسجدیں وغیرہ

تاریخِ ادب
 وغیرہ تعمیر کیں۔ حیدر آباد میں پہلی مرتبہ ایک بڑا دواخانہ، دواخانہ افضل گنج کے نام سے تعمیر ہوا جہاں مریموں کا علاج مفت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں زائرین اور حاجیوں کے لیے شاندار رہائش گاہیں جو رباط افضل الدولہ کے نام سے مشہور تھیں جن میں آرام و آسائش کے ساتھ مفت چھپرے اور مفت طبی سہولت کا معقول انتظام تھا۔

مغفرت مکان لؤاب افضل الدولہ کو "مولود شریف" کا بڑا والہا فوق تھا۔ مولود خوانوں کی جماعتیں سڑکار میں ملازم تھیں۔ ادب و احترام کا یہ حال تھا کہ کبھی سوتے ہیں رات کے وقت مولود خوانی کی آواز دور سے بھی سن لیتے تو اٹھ بیٹھتے۔ خدام بارگاہ دست بستہ آرام کرنے کا معروضہ کرتے تو فریضہ عقیدت سے فرماتے کہ پاؤں کیسے لمبے کر دوں بے ادبی ہوگی۔ معلوم نہیں مولود خوانی کس طرف ہو رہی ہے! لؤاب افضل الدولہ کے اس حذبہ عقیدت کے احترام میں آج بھی مکہ مسجد میں بعد نماز جمعہ صوفی افضل الدولہ کے مزار پر پابندی سے مولود خوانی ہوتی ہے اور بکثرت لوگ حلقہ باندھے سر جھکائے با ادب کھڑے سنتے ہیں۔

آ علی حضرت مغفرت منزل | مقبرہ کے مغرب سے مشرق کی طرف دوسری
 لؤاب سکندر جاہ بہادر | قبر آ علی حضرت مغفرت منزل لؤاب میر اکبر علی خان
 سنہ ۱۱۸۱ھ تولد ہوئے۔ اپنے والد لؤاب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے بعد ۱۲۱۸ھ وراثت تحت و تاج ہوئے چھبیس سال حکومت کی۔ دس برس مرض استسقاء میں مبتلا رہ کر بیٹا و ن (۵۷) سال کی عمر میں روز جمعہ سنہ ۱۲۲۲ھ وفات پائی۔

لؤاب سکندر جاہ کے مقبرہ کے شمالی دروازہ کے اوپر حسب ذیل

شعار کندہ ہے،

بود شاہ دکن سکندر جاہ در ملاطین ہند بے ہمتا

عادل و باذل و شجاع و جری سعدن خلق و کان علم و حیا
چون بہ گلشت باغ جنت رفت داغ حسرت گذاشت بر دلہا
شدہ در ماتمش جہان تاریک پُر شد از غم زارض تا بہ سہا
آمدش از سہ الم تاریخ آہ رفت آفتاب از دنیا
مزار کے کتبہ پر تاریخ وفات:

چون سکندر جاہ از آفات رفت : ہر مکان شد از غمش بیت الحزن
بر کشیدم آہ و گفتم سال او : راہی فردوس شد شاہ دکن !
۵۱۲۴۲

یہ شعر بھی کندہ تھا :

کرد شاہ دکن زد ہر کنار : یک ہزار و دو صد و چیل و چہار
شہزادی یا اور النساء بیگم | اس سلسلہ کی تیسری قبر شاہزادی یا اور النساء بیگم
صوت "مزار صاحبزادی یا اور النساء بیگم" لکھا ہوا ہے لیکن یہ کس کی صاحبزادی تھیں
اور تاریخ وفات کیا ہے اس کا اندراج نہیں دراصل شہزادی صاحبہ اعلیٰ حضرت
لذاب میر عثمان علی خاں کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں جن کی تاریخ ولادت
۲۵ رمضان سنہ ۱۳۲۶ھ اور تاریخ انتقال چہار شنبہ ۳ جمادی الاولیٰ
سنہ ۱۳۳۳ھ ہے۔

شہزادی نظام النساء بیگم صاحبہ | اس سلسلہ کی چوتھی قبر شہزادی نظام النساء بیگم
صاحبزادی غفران مکان علیہ رحمۃ کا اندراج تو موجود ہے لیکن تاریخ وفات
موجود نہیں ہے۔ شہزادی مرحومہ اعلیٰ حضرت غفران مکان لذاب میر محمود علی خاں
کی سب سے بڑی اور عزیز ترین شہزادی تھیں جو ان کی محل حضرت مہدی بیگم صاحبہ

لہ جمیعہ غیر معمولی ۴۲ رری بہشت ۱۳۲۵ھ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ چہار شنبہ

کے لجن سے ۳۱ شوال سنہ ۱۳۳۱ھ کو پیدا ہوئیں اور تیس سال کی عمر میں کہ ہنوز ان بیاہی تھیں داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کے المناک یوم وفات کی دیرینہ یادگار و کٹوریہ زنا نہ اسپتال کی رفیع الشان عمارت سے لول وابستہ ہے کہ اس کا سنگ بنیاد اسی روز غم و اندوہ کی فضاء میں پرنسس سیری آف ویلز کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ کسی وقت شاہزادی کی قبر پر سنگ سرور کا مقبرہ موجود تھا۔ لیکن نام اور تاریخ وفات کا کوئی کتبہ کندہ نہ تھا۔

شہزادی ہدایت النساء بیگم صاحبہ | یہ شہزادی کون تھیں اور تاریخ وفات کیا تھی یہ تو درج نہیں صرف مزار صاحبزادی ہدایت

بیگم فریم میں لکھا ہوا ہے۔ دراصل شہزادی ہدایت النساء بیگم عرف پھلی صاحبزادہ حضور نظام نواب میر عثمان علیخان کی عزیز ترین شہزادی تھیں جن کی ولادت ۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۷ھ میں ہوئی اور وفات ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ شب دوشنبہ کو ہوئی۔ بعد نماز ظہر مکہ مسجد میں حفرت جماعت علی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس مقبرہ میں یہ ایک ہی قبر ہے جس کے اوپر درمیان میں "اورثت حنفیۃ النبیۃ کندہ ہے۔" ۱۳۳۵

حضرت عمدہ بیگم صاحبہ | حضرت عمدہ بیگم صاحبہ مغفرت مآب نواب آصف جاہ اول کی محل اور نواب نظام علی خاں آصف جاہ

ثانی کی حقیقی والدہ ماجدہ تھیں۔ آپ کا انتقال حیدرآباد میں ۲ ذی الحجہ ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔ ان دنوں نواب نظام علی خاں حیدرآباد سے باہر جنگ میں مصروف تھے۔ صاحب صولت عثمانی "کھتے ہیں ممدو حد کے انتقال کے بعد اسطوحبہ مدار المیام اور امرائے دولت نے صحن مکہ مسجد میں دفن کے لیے جگہ تجویز کی۔"

لے جرمیدہ غیر معمولی جلد (۳۷) مورخہ ۱۳۱۵ ف م ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ
لے آثار صادقہ دکن مصنفہ سید ہالوں مرزا میر ستر
لے جرمیدہ غیر معمولی جلد (۵۷) ۱۴ آذر ماہ ۱۳۳۵ ف م ربیع الاول ۱۳۴۲ھ

یہ صحن مکہ مسجد کی پہلی قبر ہے۔ [د مٹ] نواب نظام علی خاں بعد اختتام جنگ سنہ ۱۱۹۰ھ مراجعت فرمائے حیدر آباد ہوئے اور اپنی والدہ ماجدہ کے مراسم زیارت بجالائے۔

شہزادی مسرت النساء بیگم صاحبہ [مزار شہزادی مسرت النساء بیگم] لکھا ہوا ہے۔ شہزادی مرحومہ حضور نظام نواب میر عثمان علیخان کی صاحبزادی تھیں راقم الحروف کو ان کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ زیرہ تحقیق ہے۔

شہزادہ نواب میر غلام عبدالقادر علیخان | کے فرزند شہزادہ میر غلام عبدالقادر علیخان

حضرت سردار بیگ صاحبہ کے بلن سے بمقام محل لنگم پل روز پنجشنبہ ۲۸ رمضان ۱۲۱۲ھ تولد ہوئے اور ایک سال بعد ۸ رمضان سنہ ۱۲۱۳ھ یکشنبہ گیارہ بجے شب بمقام کوہ مولا انتقال کیا۔ ۹ صبح ۹ رمضان سنہ ۱۲۱۳ھ مکہ مسجد کے شاہی مقبرہ میں تدفین ہوئی۔ اس شہزادہ کی پیدائش کی تہنیت میں مہاراجہ کشن پراد شاد مدارالمہام نے ایک قصیدہ بارگاہ سلطانی میں گزانا تھا۔ یہ قصیدہ ایک کتابچہ کی صورت میں ”ارمغان زیبا سے نذر سلطان“ کے عنوان سے ۱۲۱۲ھ میں شائع بھی ہوا تھا۔ قصیدہ میں شہزادے کا نام میر غلام عبدالقادر علیخان ہی لکھا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے قبر پر رکھے جانے والے فریم میں نظام میر قادر علیخان اور تاریخ وفات سنہ ۱۳۱۱ھ قابل اصلاح ہے۔ مورخین نے بھی بغیر تحقیق نام غلط لکھا ہے اس قبر پر کسی دقت سنگ مرمر کا مقبرہ بنا ہوا تھا (ملاحظہ ہو آثار ضا دید دکن)

غفران مآب نواب نظام علیخان | غفران مآب نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی مغفرت مآب نواب آصف

جاہ اول کے چوتھے صاحبزادے تھے جو ۱۲۶ھ تولد ہوئے اور سنہ ۱۱۵ھ تخت آصف جاہ پر بیٹھیں ہوئے۔ تیس سال حکومت کرنے کے بعد تین سال مرض خالج میں مبتلا رہے کہ بعد تر ہتر سال، ربیع الآخر

سنہ ۱۲۱۸ھ دنیا سے رخصت ہوئے لؤاب نظام علی خان کی محل حضرت بخشش صاحبہ کو آپ سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ اس بناء پر لؤاب نظام علیخان کی قبر اور مقبرہ انھوں نے اپنے مرنے سے بنوایا چنانچہ اس دور کے شاعر شاہ کتر اپنی مثنوی ”داستان نظام علیخان“ میں اس کا ذکر کیا ہے:

سو بخشش بیگم ہو کے نگین زار
تکلف سے بنوائی ان کا مزار

عجب وہ نادر و روتی بھدا

وہ بنوائی لؤاب کا مقبرہ

حضرت بخشش بیگم صاحبہ نے نہ صرف خوبصورت مقبرہ بنوایا بلکہ ہر سال لؤاب نظام علی خان کے عرس کی طرح بھی ڈالی جو نہایت شامانہ اہتمام اور کدفر سے ہوتا تھا۔ شاہ کتر نے اس عرس کا حال بہت عمدگی اور تفصیل کے ساتھ اپنی مثنوی میں لکھا ہے۔ اعلیٰ حضرت لؤاب میر عثمان علی خان کے عہد حکومت تک لؤاب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے عرس کا انتظام اور صندل کا اہتمام ہر سال سرکاری طور پر پابندی سے ہوتا تھا۔ لؤاب نظام علی خان کے مقبرہ کے دروازہ پر حیدر آباد کن کے مشہور شاعر اسنادن شیر محمد خان ایماں کا قطعہ تاریخ دفنا کئے تھے۔

بر روح پاک میر نظام علی خان دلم - خوانند باد صوبہ اشفاق و فائقہ

زمین مہر عجب عجیب و تو تاریخ رانجوان - مستوجب بہشت و با غلام فائقہ

۱۲۱۸ھ

۱۲۱۸ھ

صورت عثمانی ۸۳

مغرب سے مشرق کی سمت دسویں قبر

آغا حضرت غفران منزل لؤاب ناصر الدولہ

(لؤاب میر فرخندہ علیخان) کی ہے۔ آپ

آغا حضرت غفران منزل

لؤاب ناصر الدولہ بہادر

۲۲ رمضان سنہ ۱۲۶۸ھ بمقام قلعہ بیدر پہنچا ہوئے۔ اپنے والد لؤاب سکند

جاہ بہادر کے انتقال کے بعد ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۲ھ تخت نشین ہوئے۔

انیس روز بیمار رہ کر بعمر پینسٹھ (۶۵) سال ۲۱ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ بمطابق
مغلی بیگم صاحبہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مدت حکومت اٹھ سال رہی۔
لؤاب ناصر الدولہ کے مقبرے پر حسب ذیل تاریخ وفات کندہ تھی:

چوں رفت لؤاب ناصر الدولہ سے جنت زواریانی : خدایش بخشد در گردشش بفضل رحمت مقام والا
مہ صیام از شعور بودہ است و بدست ویک نام کہ درادش ایزد بقصر خبت بعد عز مقام والا
سروش غیبی برک ساش گوش جان خواند مقرر خوش : ناصر الدولہ داد اینز میاں جنت مقام والا
اعلیٰ حضرت غفران منزل لؤاب ناصر الدولہ کی

تبر کے بعد اعلیٰ حضرت غفران مکان لؤاب
میر محبوب علیخان کا مزار ہے۔ اعلیٰ حضرت مرحوم

بروز جمعہ بوقت شب "عشرت محل" متصل "خلوت مبارک" ۵ ربیع الاخر سنہ
۱۲۸۳ھ پیدا ہوئے اپنے والد لؤاب افضل الدولہ کے بعد بعمر ۲ سال سات ماہ
پندرہ یوم مسند نشین ہوئے [۱۵ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ م فروری ۱۸۶۹ء] بیالیس ۴۲
سال حکومت کرنے کے بعد چھیالیس ۴۶ سال کی عمر میں سبھنبہ ۴ رمضان ۱۳۲۹ھ
م مارچ ۱۹۱۱ء ایک بچے دن قصر فلک نمایں اس دار فانی سے راہی ملک بقا ہوئے۔
میت قصر جو محلہ مبارک لائی گئی اور رات سوا بارہ بجے مکہ مسجد میں نماز جنازہ
کے بعد میت کا تابوت قبر میں اتارا گیا۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان لؤاب میر محبوب علیخان
بڑے نفیر قش، نیک دل اور صاحب جو دو سخا تھے۔ صحیح معنوں میں محبوب الخلاق
تھے۔ ایسے عزیز پرور بادشاہ کے دنیا سے اٹھ جانے کا رعایا کو بڑا ہمد
ہوا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو غمگین نہ ہو اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔
خود اعلیٰ حضرت غفران مکان کا یہ شعر صادق آتا تھا:

اس کا مشتاق ہوں لے آؤ مری میت پر

جس کو لوگوں نے عوض گریہ کے خندان دیکھا

آپ کے مزار پر الوار کے کتے حسب ذیل تھے:

الف: روضۂ سلطان محبوب علی [۲۹ ۱۳۵ھ]

ب: و انه في الآخرة بمن الصالحين (۱۳۲۹)

ج: شد بفر دوس برس غفران مکان : میر محبوب علی خان بادشاہ

مصرعہ تاریخ صدیقی بخوان : رحمت حق باد بر آن بادشاہ
(صولت عثمانی)

سلاطین کے اس مقبرے میں اعلیٰ حضرت غفران مکان کا ہی ایسا مزار ہے جس پر ہمیشہ ہر وقت سبز غلات رہتا ہے اور ہر مذہب و ملت کے زائرین گُل ہائے عقیدت چڑھاتے ہیں !

شہزادہ نواب صلابت جاہ بہادر | اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان کے پہلو میں بائیں طرف

ان کے عزیز ترین صاحبزادے نواب میر احمد محی الدین علیخان (نواب صلابت جاہ بہادر) مدفون ہیں جو حضرت اچالابیکم صاحبہ کے بطن سے ۹ رجب سنہ ۱۳۲۵ھ پیدا ہوئے۔ بوقت انتقال اعلیٰ حضرت غفران مکان شہزادہ مرحوم کی عمر صرف چار سال تھی۔ ستائیس سال کی عمر میں ان کے بنگلہ ”بن ہور“ سوامی گوڑہ ۲۵ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۲ھ وفات پائی حضور نظام نواب میر عثمان علیخان یا پیادہ سوامی گوڑہ سے ”کپ کے سانچہ“ جنازہ کے ساتھ رہے اور وہاں سے موٹر میں مشائعت کی اور مکہ مسجد میں نماز جنازہ اور تدفین میں شریک رہے۔

شہزادی احمد النساء بیگم صاحبہ | شہزادی احمد النساء بیگم صاحبہ اعلیٰ حضرت غفران مکان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اور

نواب صلابت جاہ کی حقیقی بہن تھیں جو ۲۹ صفر ۱۳۲۸ھ حویلی قدیم میں پیدا ہوئی۔ انے بھائی نواب صلابت جاہ کے انتقال کے دو ہفتہ بعد علک باغ کنگ کوٹھی میں تیس سال کی عمر میں مرض چچک سے شہید ہوئی الحجہ ۱۳۵۲ھ

تاریخ و ادب میں
 میں وفات پائی۔ حضور نظام لواب میر عثمان علی خان جنازہ کے ساتھ پیدل
 کنگ کوٹھی سے افضل گنج پل تک آئے اور وہاں سے موٹر میں جنازہ کے
 ساتھ مکہ مسجد تشریف لائے اور نماز جنازہ اور تدفین میں شریک رہے۔
 قبر پر رکھے جانے والے فریم میں صفت نام درج ہے تاریخ وفات کا بھی انداز
 ہونا چاہیے۔

شہزادی احمد النساء بیگم صاحبہ کے بعد
شہزادہ لواب اعظم جاہ بہادر | اس منقرہ کی آخری قبر لواب میر
 حمایت علی خان (لواب اعظم جاہ بہادر) کی ہے۔ لواب اعظم جاہ
 اعظم حضرت لواب میر عثمان علیخان کے فرزند ارکھو تھے جو ۸ محرم سنہ ۱۳۲۵ھ
 تولد ہوئے۔ حضور نظام نے لواب اعظم جاہ کو اپنا جانشین و ولی عہد نامزد
 کیا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ان کے فرزند لواب مکرم جاہ بہادر کو جانشین بنانے
 کا اعلان فرمایا۔ لواب اعظم جاہ کا انتقال مختصر علالت کے بعد ان کے
 بنگلہ واقع بنجارہ ہل روز جمعہ ۷ شعبان المعظم سنہ ۱۳۹۰ھ (۹ اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء)
 بارہ بجکر پانچ منٹ پر بعمر ترسٹھ (۶۳) سال ہوا۔

مسجدِ جوڈی اور مزارِ آصفِ سابع

حضور نظام آصف سابع کے محلِ سنگ کوٹھی کے یادگار پردہ گیٹ (جہاں آج بھی دبیز پردہ آویزاں ہے) کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھیں تو سامنے ایک اوجھاٹیلہ نظر آتا ہے۔ حضور نظام کے وقت اس ٹیلے پر عمارتیں نہیں تھیں۔ سب سے پہلے اس پر مسجدِ جوڈی اور مقبرہ جوڈی کی تعمیر حضور نظام نے کی لیکن آج یہاں تین تین منزلیں عمارتیں کھڑی ہیں۔ ان عمارتوں کے وسط میں مسجدِ جوڈی ایستادہ ہے، اس مسجد سے ملحق مقبرہ جوڈی ہے جس میں حضور نظام آصف سابع کا مزار ہے۔

مسجدِ جوڈی کے بابِ الداخہ پر دو چھوٹے مینار ہیں اور دروازے کی پیشانی پر سنگِ مرمر کی تختی ہے اور اس پر حضور نظام کا یہ قطعہ کندہ ہے،

بہر اراج مصفا مسکن بہبودی بود
گفت باریک نظر منظر مشہودی بود
نیست این بیت سترن بلکہ ریاضِ فردوس
گفت عثمان کہ ہیں مقبرہ جوڈی بود

اس بابِ الداخہ کی پشت پر ایک اور سنگِ مرمر کی تختی چسپیدہ ہے اور قطعہ تاریخِ پانچویں صدی ہجری اس طرح درج ہے:

مادۃ تاریخ مسجدِ جوڈی
از مسعود علی محوی

لے البتہ یہاں شاہی موٹر خانہ تھا اور یہیں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی جسے موٹر خانے کی مسجد کہتے تھے۔

شہزجود حضرت عثمان علی شاہ دکن
مسجد جودی بناؤ قبرا معصومے در آل
ہست تاریخ ہائے این مقام دیکشا
خواب گاہ شانزادہ سجدہ گاہ سرلابان
۵۶ ————— ہجری ————— ۱۳

مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک وسیع کھلا صحن نظر آتا ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر دیکھو تو سیدھی جانب کونے میں سنگ مرمر کی ایک قبر نظر آتی ہے اور قبر کے کتبے پر نام اور تاریخ وفات موجود ہے۔ دراصل یہ حضور نظام کے ایک خانہ زاد کی قبر ہے جن کا نام یوسف بن حسین المصلی عرف موسیٰ علی تھا۔ کسی نامعلوم شخص نے بندوق سے ان پر فائر کر کے ۲۴ مارچ ۱۹۶۸ء کو انہیں ختم کر دیا اور شاہی قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ بائیں سمت دھوکے لیے ٹوٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ اسی طرف پیشاب خانہ اور بیت الخلاء ہے صحن کے وسط میں اذان دینے کے لیے اُونچا منبر ہے۔ اس منبر کے نیچے چار قبریں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں جن پر مین کے ڈھکن ڈھکے ہوئے ہیں۔ قبروں پر جو نام درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مدفون شاہی خاندان کے فرد ہیں، ابھی ایک سال پہلے حضور نظام کے دو فرزندان کا انتقال ہوا تو ان کی قبریں بھی اسی صحن میں بنیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت یہ کھلا صحن شاہی افراد خاندان کی قبروں سے پیٹ جائے گا۔

آگے بڑھو تو درباب الدافلہ پیش نظر ہیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف کا دروازہ مقبرہ جودی کا ہے اور بائیں طرف کا مسجد میں داخل ہونے کا۔ مقبرے کے باب الدافلہ کی پیشانی پر سنگ مرمر کی تختی پر والدہ حضور نظام کی تاریخ وفات صفت تدفیلہ اور شجرہ میں کندہ ہے:

ز ترکِ نعمت دنیا چہ غم بہ مادرِ شاہ
کہ بہر او بہ جناحِ راح و روحِ دیوانست
”دُرُجف“ ز بسالے بہ چین کہ خفتہ بَرَن
کنیزِ فاطمہ و اُمِ شاہِ عثمانست

۱۶۹۷

۳۳۷

یہ بتانا اس موقع پر مناسب ہے کہ جناب مسعود علی تھوئی جن کے قطعاً
تاریخی کو حضور نظام نے شرفِ قبولیت بخشا، فتح پور [اودھ] کے متوطن
تھے۔ وہ فارسی زبان کے ہمہ داں شاعر تھے اور مرتبہ استادِ کار کہتے
تھے۔ حیدر آباد دکن میں معش نخج کے عہدے پر فائز رہے۔

مقبرہ اندر سے مربع اور چاروں طرف پانچ پانچ کمانوں سے گھرا ہوا
ہے۔ درمیان میں سنگِ مرمر کی چار قبریں ایک صف میں بنی ہوئی ہیں۔ مغربی
سمت میں پہلا نزار حضور نظام میر عثمان علیخان آصف سابع کا ہے۔ اس
کے ساتھ حضور نظام کی والدہ کی قبر ہے، اس سے لگے ہوئے سنگِ مرمر
کے چبوترے پر چھوٹی سی قبر شہزادہ جواد جاہ کی ہے اور اس کے بعد دوہین
پاشاہ محل حضور نظام آسودہ ہیں۔ شمالاً و جنوباً اور مشرق کی سمت جو گیارہویں
ہے، اس میں سنگِ مرمر کی اکتیس قبریں شاہی خاندان کے افراد کی ہیں۔ ہر قبر
پر نام اور تاریخِ وفات درج ہے۔

صناعی اور سنگ تراشی کا یہاں کمال نہیں البتہ سادگی میں جمال نظر آتا
ہے۔ تمام فرش صاف اور چمکے پتھر کا ہے۔ جانبِ مشرق ایک ہال ہے جس
کے دروازے پر سنگِ مرمر کی چھوٹی تختی پر سولے حروف میں ”بیت الحزن“ لکھا
ہوا ہے۔ اسی ہال میں حضرت امام حسینؑ کی ضریح مبارک شیشے کے فریم میں رکھی
ہوئی ہے۔ حضور نظام کے وقت یہاں علمِ استادہ رہتے تھے اور محرم میں مجلس
عزا برپا ہوتی تھی لیکن اب صرف ایک چھوٹا سا علم دکھائی دیتا ہے اور محرم
میں کبھی کبھی مجلس ماتم ہوتی ہے۔ ہال ہمیشہ مفصل رہتا ہے۔ یہ ہال حضور نظام

شہزادہ جواد علی خاں المحاطب جواد جاہ حضور نظام کے محل لالی بیگم صاحبہ کے لہن سے پہلے فرزند تھے جو ۱۲۵۲ھ ۱۳ شنبہ ۲۱ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے، لیکن دیر ۷ سال کی عمر جب ہوئی تو شہزادہ جواد جاہ ۲۳ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۶ء شب جمعہ ۲ انتقال کر گئے شہزادہ جواد جاہ کی وفات اور ان کے یہاں دفن ہونے کے بعد اس مقبرے اور اس مسجد کی بنیادی۔ حضور نظام جواد جاہ کو بہت چاہتے تھے۔ اپنے منظور نظر چھوٹے شہزادے کے نام سے مقبرہ اور مسجد کی تعمیر خود حضور نظام کی اس شہزادے سے بے انتہا محبت کا واضح ثبوت ہے۔ اس مقبرے میں ایک تصویر [جس پر پردہ پڑا رہتا ہے] لگی ہوئی ہے جس میں حضور نظام شہزادہ جواد جاہ کو گود میں لیے کھڑے ہیں جو فرمان جبریدہ غیر معمولی مدد ۶۷ سید الاقط ۱۳۶۰ھ دوشنبہ شرف مدور لایا، اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔۔۔۔۔ دوسری طرف یہ مختصر سا خانہ رانی مقبرہ ہے جس کو میں نے معصوم مرحوم کی یاد میں تعمیر کیا تھا جو کہ اپنی کچھ نہ کچھ حیثیت رکھتا ہے اور بس۔

شہزادہ جواد جاہ کی قبر پر اس طرح لکھا ہوا ہے :

مغربی سیمت : از قلب شکستہ آصفِ ساج

سُبْحَانَ اللَّهِ هَذَا الصَّبِيُّ شَهِيدٌ

خود حضور نظام نے اپنے دست مبارک سے شہزادہ کو غسل دیا اور لباس آخری پہنایا۔

مشرقی سمت: متعلق زفاتِ حسرت آیات میر جواد علی خاں المخاطب۔
پائنتی، جواد جاہ

جواد جاہ کی والدہ جناب علی بیگم کا انتقال حضور نظام کی زندگی میں
چار شنبہ ۷ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ [اگست ۶۲ء ۱۹ء] کو ہوا۔ ان کی قبر بھی
اسی مقبرے میں ہے۔

جواد جاہ کی قبر کے بعد دوسری قبر جو بی وہ حضور نظام کی والدہ کی قبر ہے
جن کا انتقال ۱۶ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ (۱۴ اپریل ۱۹۴۱ء) پرانی حویلی میں
پچھتر سال ہوا۔

[۱] سر بانے : المطمئنہ رُپگ

یَا یٰهَا النِّفْسُ ارْجِعِیْ اِلَیَّ۔

[۲] پائنتی : عجب نقشہ گز این رخ و الم ہست

کہ در مساتم ہنر قلم ہست

طوافی می کنم عثمان لحد را

سر لوے چہ تصویر و لم ہست

[۳] سیدھی جانب :

در چمن لوزہ کناں غنچہ دگل ہا بودہ

نیز خوں گشتہ دل ساغر دنیا بودہ

جام و شیشہ کہ بگشتہ ہمہ پارہ پارہ

رنگِ خونِ جگرے شائل صہبا بودہ

آنکہ رفتہ ز جہاں بادلِ خرم گفتہ

ہر چہ حاصل کہ شدہ عین تمنا بودہ

اوبرفت وہ غم ورنج و تعب عثمان گفت

در حق من ہنر ما در یکتا بودہ

مقطع تخرجہ ۵۱۳۶۰ [لا ریب فیہ]

مادرِ آصفِ سابعِ امۃ الزہرہ بیگم ور ہفتاد سالہ انتقال کرو۔

اشکِ ریزاں تو نگہ ہر گل و شبنم اینجا

بہرِ تعظیمِ نگرِ سبیلِ پُرِ خشم اینجا

ہر کہ آید بہ زیارتِ چہ بگوید عثمان

قلبِ محزون تو مدانِ دیدہ پُرِ غم اینجا

اے زہے سخت کہ ایں کو کبِ ناہید شدہ

بہرِ الوار و کرمِ نینرِ مواعد شدہ

اپنی والدہ کے ساتھ شاہ عثمان نے ہمیشہ ادب و احترام کا سلوک برقرار رکھا۔ بوقتِ انتقال (۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء چہار شنبہ) رات ڈیڑھ بجے حضور نظام

پُرانی حویلی میں موجود تھے۔ جنازہ جنازہ پُرانی حویلی میں ادا ہوئی۔ خاص دعاء کو

نمازِ جنازہ میں شرکت کی اجازت دی گئی۔ پونے چھ بجے شام حویلی قدیم سے

جنازہ برآمد ہو کر پائے بجے شام مسجدِ جوہی پونے دو گھنٹے میں پہونچا۔ حضور نظام

جنازہ کے ساتھ ساتھ پیدل مسجدِ جوہی تک چلتے رہے۔ موسم گرم تھا۔

راستے میں کبھی مولانا حضرت سید محمد پاشا حبیبیؒ سے کچھ مولانا عبدالقدیر بدایونی

اور کبھی شاہی اسٹاف سے مخاطب ہو کر مرحومہ کے اوصاف بیان کرتے جاتے

تھے۔ دفن سے پہلے [سوا آٹھ بجے شب] بھی مرحومہ کے فضائل بیان کیے

”طوائفِ می کنم عثمانی لحد را“

سے بھی حضور نظام کی اپنی والدہ سے حد درجہ عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔

فرمانِ جبریدہ غیر معمولی مورخہ ۱۶ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ میں فرمایا ”ان کی شفقتِ

مادری کا خیال مجھ کو اپنی بقیہ عمر میں سامانِ صبر و تسکین پہونچاتا رہے گا جو

کہ بالکل میرے لیے کافی ہے اور ان کی یاد کبھی اور کسی دن میرے قلبِ محزون

سے محو نہیں ہو سکتی“

مادرِ دکن کی قبر کے بعد تیسری قبر حضور نظام کے محلِ اولیٰ و دہن پاشا

کی اس مقبرے میں تعمیر ہوئی۔ مشرقی سمت سے شمار میں یہ پہلی قبر ہے۔ دولہن
پاشاہ ملکہ دکن تھیں جن کا انتقال یہ بمقام اعجاز باغ متصل عدن باغ ۱۵
فروری ۱۹۵۵ء شنبہ (۲۷/۱۳۷۵) ۸ بجے شب ہوا۔ اس وقت حضور نظام
تخت سے دست بردار ہو چکے تھے۔ دولہن پاشا، لواب اعظم جاہ، لواب معظم جاہ
اور شہزادی پاشا [احمد النساء بیگم] کی حقیقی والدہ اور شہزادہ سکرم جاہ و شہزاد
مفتح جاہ کی حقیقی دادی تھیں۔ از روئے نفلہ ہجری عمر (۶۲) سال تھی۔ قبر پر
نام اور تاریخ وفات اس طرح کندہ ہے :

مادۂ تاریخِ رحلت دولہن پاشا مرحومہ

(اعجاز النساء بیگم)

شعبہ ایں چہ ہست یا بازی
گفت عثمان عجیب دم سازی
سالِ رحلت چہ یافتہ عثمان
در دکن ہست شانِ اعجازی

۱۳۷۳ھ

بگفت سنبہ نورس کہ مرغِ نالان است
فردہ غنچہ و گلِ نیز، سحرِ عثمان است
ز فکرِ سالِ وفاتش برآمدہ صد آہ
بہ ہیں چہ خفتہ در این جا کہ اُمِ انبال است

۱۹۵۵ء

تاریخِ وفات

پائنتی

۲۱ جمادی الثانی ۱۳۷۴ھ

مطابق ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء

دولہن پاشا کا خاندانی نام اعظم النساء بیگم ہے لیکن جب ۱۹۰۶ء (۱۳۲۴)
عدن باغ میں حضور آصفِ سابع سے عقد ہوا تو بوقتِ نکاح میر محبوب علی پاشا

نے اعجاز النساء بیگم نام عطا کیا۔ چنانچہ یہی عطا کردہ نام قبر پر بھی لکھا گیا۔ دہلین پاشا لقب ہے۔

اب ہم جن مزار کے پاس ادب سے کھڑے ہیں اعلیٰ حضرت عثمان علی خاں آصف جاہ سابع آخری تاج دار سلطنت آصفیہ کا ہے۔ ایک زرین غلات ہمیشہ قبر پر رہتا ہے اور سال میں ایک مرتبہ برسی کے موقع پر بدلا جاتا ہے سنگ مرمر کی خوب صورت قبر پر اُبھرے ہوئے گل بوٹوں کا کام ہے۔ قبر کا سرہانہ - لواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع خلد مکان پائنتی - تاریخ وفات ۱۵ ارذی القعدة الحرام ۱۳۸۶ھ قبر کے اوپر سرہانے۔

لک نصیرؑ وا حسنؑ قبلہ

قبر کے اوپر چھوٹا تعویذ ہے جو ہرے رنگ کا ہے اور اس میں اُبھرے ہوئے سنہرے حروف میں ایک طرف لا الہ الا اللہ اور دوسری طرف مُحَمَّدٌ رسول اللہ لکھا ہے۔

مزار پر تاریخ وفات ۱۵ ارذی قعدہ لکھا دیکھ کر ہمیں تعجب ہوا۔ حالانکہ حضور آصف سابع کا انتقال جمعہ ۱۴ ارذی قعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۹۶۷ء دوپہر ایک بج کر بائیس منٹ پر مختصر سی علالت کے بعد ندری باغ میں ہوا۔

دوسرے دن ۱۵ فروری کنگ کوٹھی کے عقبی لان پر شامیہ لگا کر غسل دیا گیا۔ بارکس کے معلم کی جماعت نے مولانا فرید پاشا، مولانا قطب الدین حسینی اور مولانا فرید الدین حسینی کی نگرانی میں غسل سرانجام پایا۔ اس کے بعد میت کو کنگ کوٹھی میں شامیانے کے نیچے رکھا گیا تاکہ عوام سلاطین آصفیہ کے آخری بادشاہ کا دیدار کر سکیں۔ ۸ بجے صبح میت ساگووان کے صندوق میں رکھی گئی۔ صندوق پر قیمتی تالین ڈالا گیا تھا۔ ۸ بجے اللہ اکبر کے نعرہ میں صندوق امبولنس کار میں رکھا گیا۔ امبولنس کار کے پیچھے چالیس موٹریں اور کئی بسیں تھیں۔ جلوس جنازہ عابد روبر، معظم جاہی مارکٹ، سدی عنبر بازار

نیا پل، چار مٹیار ہوتا ہوا سکہ مسجد پہنچا۔ مکہ مسجد کے دروازے پر کار سے میت اتار کر ساگوان کے ڈولے میں رکھی گئی، ادھر شامیانہ تھا جسے عرب گارڈ تھامے ہوئے تھے۔ جنازہ منبر کے پاس رکھا گیا۔ حضرت حبیب جعفر العیدروس نے نواب مکرم جاہ بہادر کی اجازت سے نماز جنازہ پڑھائی۔ دو لاکھ افراد نے نماز جنازہ پڑھی۔ جنازہ جب باہر آیا تو فوجی جواؤں نے جنازہ حاصل کیا۔ میت پر زر دآصفی پر چم اڑایا گیا۔ امبولنس میں نواب مکرم جاہ بہادر نواب مفتاح جاہ بہادر اور شہزادی پاشاہ (صاحبزادی حضور نظام) میت کے ساتھ تھے۔ لاکھوں لوگوں کا ہجوم، سب کے منہ چہرے۔ حیدر آباد پول کے دل میں وہی ادب احترام موجزن تھا۔ جو حضور نظام کی زندگی میں محسوس ہوتا تھا۔

مسجد جودی سے کچھ فاصلہ پر کار ٹھہرائی گئی۔ عرب گارڈ نے جنازہ اٹھایا اور قبر تک پہنچایا۔ عرب فوجی دستہ اور سکھ پلٹن صرف خاص کے لباس میں ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے میت کے ساتھ ساتھ کنگ کوٹھی کے انجینئر مسٹر کیو سوامی کی نگرانی میں قبر تیار ہوئی تھی۔ قبر میں منبر اور عبیر کے علاوہ عربی کلاب چھڑکا گیا۔ حضور نظام کے دو ملازمین منصور علی اور محمد بن بابیل نے دوسروں کی مدد سے سفید کفن میں لپیٹی ہوئی میت چارنٹ گہری قبر کے اندر اللہ اکبر کے نعروں میں اتار دی۔ نواب اعظم جاہ، نواب معظم جاہ، نواب مکرم جاہ، نواب مفتاح جاہ اور دوسرے شہزادوں نے ہٹی دی۔ قبر پر پتھر کے اٹھارہ سلا رکھے گئے اور پھر مٹی سے قبر ڈھانپ دی گئی۔ مولانا حبیب احمد گوان نے لحد پر ہاتھ رکھ کر تلقین پڑھی اور پانی ڈالا۔ حضرت حبیب جعفر العیدروس نے دعا پڑھی۔

تدفین سرکاری اور فوجی اعزاز کے ساتھ عمل میں آئی۔ مسلح پولیس نے لاسٹ پوسٹ سجایا۔ فوجی سپاہیوں نے بندوق سرکئے۔ اُس وقت تک چیف منسٹر برہمانند ریڈی، ڈاکٹر چارٹیڈی، انسپٹر جنرل پولیس، وزراء، عہدار علاوہ مشائخ موجود تھے۔ تدفین کے بعد عوام کو اندر جانے کی اجازت دی گئی۔

تمام دفاتر، اسکولوں اور کالجوں کو اس دن تعطیل دی گئی۔ دو روز تک سینا احتراماً بند رہے۔ فاتحہ سوم دوشنبہ ۲۷ فروری کی صبح مکہ مسجد میں ہوئی اور بعد فاتحہ مولانا فرید پاشا صاحب نے منبر سے نواب مکرم جاہ بہادر کی جانشینی کا اعلان کیا۔

حضور نظام آصف جاہ سابع ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ ۱۵ اپریل ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے اور ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو پیر عصر چھبیس سال تحت نشین ہوئے۔ ایک مختار کل بادشاہ کی حیثیت سے حیدرآباد دکن پر انصاف پروری کے ساتھ نینتیس سال تک فرماں روائی کی۔

سقوط حیدرآباد ۱۳۶۷ھ (۱۹۲۸ء) کے بعد حکومت سے دست بردار ہوئے جب کہ آپ کی عمر چونسٹھ (۶۴) سال تھی۔ مزید انیس سال یہ قید حیات رہنے کے بعد ۱۴ رزی قندہ ۱۳۸۶ھ (۲۴ فروری ۱۹۶۷ء) پیر عصر تراسی (۸۳) سال اس دنیا سے ناپائیدار سے عالم جاودانی کو روانہ ہوئے آپ کی تخت سے دست برداری سے سلطنت آصفیہ کا دو تہد سال شاندار دور ختم ہو گیا۔ حضور آصف سابع نے فرمایا تھا:

کرے گا اہل دولت کو نہ کوئی یاد اے عثمان
صحائف ہی میں دفن افسانہ جاہ چہم ہوں گے

لیکن اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع دنیا کے ان دولت مند ترین لوگوں میں اس امتیازی مقام پر تھے جنہوں نے رفاہ عام کے ہزاروں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آپ کے بناء ہوئے ٹرسٹ جن سے آج بھی بلا لحاظ مذہب دملت، طالب علموں، تعلیمی اداروں، غرباء، معذوروں، بیواؤں کو فیض پہنچ رہا ہے۔ رفاہ عام اور علم و فن کی ترقی کے لیے جو کچھ حضور نظام نے کیا اگر کوئی لکھنے بیٹھے تو کئی جلدوں کے ورق تمام ہو جائیں گے اور مدح باقی رہے گا۔

مقبرے کے ملحق مغربی سمت مسجد جودی ہے۔ سامنے پانچ خوبصورت

کمانیں بنی ہوئی ہیں درسیان کی کمان پر سنگ مرمر کی تختی پر حضور نظام کا قطعہ کندہ ہے:

۷۸۶

مادۂ تاریخِ پناہ مسجدِ جوہی
جلوہ درخشائے خُدا بنگر
لور و ر شکلِ مُصطفیٰ بنگر
از زبانِ نبی شنو عثمان
علم باللہ بہ مرتضیٰ بنگر

مسجد نہایت پاک و صاف اور فرش و فرش سے آراستہ ہے۔ امام اور موذن مقرر ہیں اور پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نماز جمعہ عیدیں اور پھر رمضان میں تراویح کا بھی انتظام ہے۔ ہمہ وقت چار پہرہ دار موجود رہتے ہیں جن کے ذمہ مقبرے اور مسجد کی نگرانی اور صفائی ہے۔ دفتر ناظم امور مذہبی صرف خاص ٹرسٹ ایچ ای ایچ دی نظام اس مسجد کے عقب میں ہے جس کے ذمہ شاہی مساجد اور شاہی مقابر کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنا ہے چنانچہ دفتر کی جانب سے اس مسجد اور مقبرے کا حُسنِ انتظام قابلِ تعریف ہے ہر جمعہ کو مقبرے کی تمام قبروں پر غلات چڑھائے جاتے ہیں اور نام کی تختی رکھی جاتی ہے اور بعد نمازِ جمعہ آصفِ سابع کے مزار پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔

حیدر آباد کی یہ واحد مسجد ہے جہاں نمازِ جمعہ کے خطبے میں نواب میر برکت علیؒ مکرم جاہ بہادر کا نام لیا جاتا ہے۔

سواری شاہانہ اور عوام کی تکلیف کا احساس

اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان کی سواری مبارک جب آمد ہوتی تو پولیس کی جانب سے بادشاہ کے گزرنے کے راستوں پر سخت انتظام ہوتا تھا۔ گھنٹوں لوگ اور سواریاں رکی رہتیں۔ بادشاہت میں شاہی انتظامات پر حرف گیری جرم سمجھا جاتا تھا لیکن اعلیٰ حضرت غفران مکان محبوب کے عہد حکومت ہو یا اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابق کا دور شاہی اس زمانے کے اخبارات دیکھنے سے یہ بات واضح ہے کہ صحافت کو اس حد تک آزادی تھی کہ وہ حکومت کے نظم و نسق پر بجا طور پر حرف گیری کرنے پر خیاںچہ عوام کی تکلیف اور احساسات کی ترجمانی ذریعہ اخبار کی جاتی تھی۔ اہم امور کی بابت اخبار کے تراشے روز پیش گاہ خبر دی میں پیش ہوتے تھے اور ملاحظہ سے گزرتے تھے۔ سرکار کی جانب سے متعلقہ عہدہ دار کا جواب طلب ہوتا اور احکام صادر ہوتے۔ شاہی سواری نکلنے وقت پولیس کی جانب سے جو انتظامات ہوتے تھے اور جن تکلیف کا سامنا عوام کو کرنا پڑتا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے اخبار نے مجلس صفائی کو پیش گوئی عسرونی میں معروضہ گزارنے کی خواہش کی :-

”اس موقع پر ہم پیش گاہ ملازمان حضرت اقدس میں ایک ناچیز گزارش کئے بغیر نہیں رہتے کہ چونکہ آج کل حضرت کی سواری مبارک بلا ناغہ برآمد ہوتی ہے اور اندرونی راستے بہت تنگ ہونے کی وجہ سے سواری نکلنے سے دو چار گھنٹے پہلے ہی راستہ پر جھٹکے اور شکرام وغیرہ اور بعض بگیاں بھی پلنے سے روک دی جاتی ہیں اور اس سے نبدکان خدا کو جو تکلیف اور ان کے کاروبار فردی میں جو ہرج واقع ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ بخوبی

کر سکتے ہیں۔ جنہیں تجربہ ہوا ہے کوئی زنانی سوار یوں کا جھٹکا ہے کہ بیماریوں کو لیے دوا خانہ جاتا ہے کوئی بے چاریاں کسی کے گھر بہانہ جانے کو نکلی ہیں اور کوئی کسی کی میت میں شریک ہونے جاتا ہے اور سب کے سب عین راستوں میں اڑے کھڑے ہیں اور پولیس والے کی منتی کرتے ہیں خوشامد کرتے ہیں مگر وہ ذرا اس سے نمٹ نہیں سکتے۔ فرعون بے سامان بنا کھڑا ہے۔ اگر سرکار اپنے نکلنے سے پندرہ سنٹ پہلے ایسا فرمادیں اور پولیس والے بیٹ کے جوان اپنے آگے والے کو بذریعہ سیٹی کے اطلاع دیں تو بطور ٹیلیفون کے حضرت کی آمد آمد کی اطلاع ہو جائے گی اور جہاں کے تہاں گاڑی جھٹکے چلنے سے چند سنٹ کے لیے رُک جائیں گے جس سے مطلب راستہ روکنے کا بھی پورا ہو جائے گا اور ناحق بندگانِ خدا کو بھی تکلیف نہ ہوگی۔ امید ہے کہ مجلس صفائی اس تجویز کو پیش گاہ سرکار میں گزارنے کا فخر حاصل کرے گی۔“

یہ ایک اخبار کا تراشہ ہے مگر معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا اخبار ہے۔ تراشہ کی پشت پر تاریخ پنجشنبہ ۳ شعبان المعظم ۱۳۱۲ھ ہفتہ وار داس اور جلد (۹) درج ہے۔

حضرت محبوب علی پاشا اخبار پڑھ کر اس تکلیف سے متاثر ہوئے جو آپ کی سواری نکلتے وقت رعایا کو بوری تھی۔ عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے فوراً ہی کوئٹہ شہر لڑاب سلطان یا درجنگ کو اخبار کا تراشہ بھیجا باز پرس کی اور جواب طلب کیا اور آئندہ کے لیے تاکید حکم دیا۔ دکن کے ہر دل عزیز حکمران محبوب علیخان پاشا کے دست مبارک سے لکھا ہوا یہ مختصر سالوئشن اس نیک نفس پاشا کی رعایا پر ددی اور انصاف پسندی کی معتبر دستاویزی شہادت ہے۔ (راقم الحروف کے پاس یہ لوشن موجود ہے)۔
نوشتہ :-

اخبار کا یہ چہ روانہ کیا ہوں۔ میں نے جو کچھ اس بارہ میں تم کو لکھا تھا تو یہ نہیں لکھا تھا کہ میری سواری آنے کے قبل دوا خانہ گھنٹے سب کو روک دیا جائے۔

نے یہ بھی نہیں لکھا تھا کہ میرے آنے کے دو چار منٹ یہ آگے بھی کسی کو روک دینے کے لئے جو کوئی درمیان میں آئے اس کو موتا کار آتی دیکھ کر بازو کرنا اور راستہ کے مت آنے دو۔ کار ایک چشم زون میں چلی جاتی ہے بعد اتی دیر کے واسطے اگر کوئی سواری روکے بھی تو یہ کوئی دیر نہیں ہے اگر تم نے کوئی حکم اپنے طور پر کو تو الی کو دیا ہے جس کے سبب سے سواریاں یا لوگ روکے جاتے ہیں تو اس کو منع کر دو اور آئندہ سے کوئی سواری یا لوگ مری سواری آتے ہی اس خیال سے دو چار تو کیا دو چار منٹ بھی مرے واسطے روکے جائیں اس کا معقول بندوبست کیا جائے اور یہ حکم تاکید ہے۔

شرح دستخط

۷ ارشعبان ۱۳۲۲ھ شنبہ

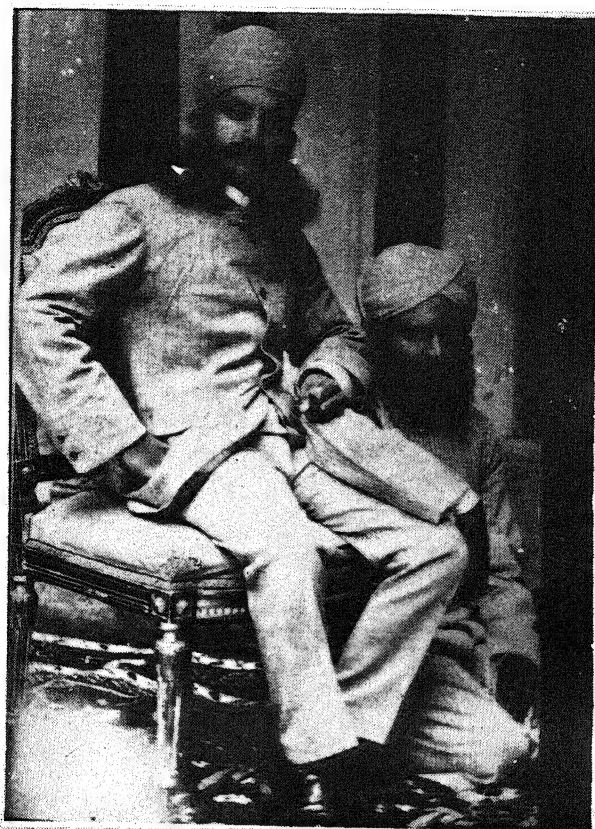
جمال صاحب میاں

لوگ اپنی قسمت پر ناز کرتے ہیں لیکن بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جن کی قسمت پر خود قسمت ناز کرتی ہے۔ جمال صاحب میاں کا شمار بھی ان ہی خوش نصیبوں میں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ عالم فاضل ~~نیکو حکم~~ ^{نیکو} بھی نہ تھے۔ طبقہ امراء میں شمار نہ ریاست کے کسی عہدہ جلیلہ پر متمکن۔ بس اتنا ہے کہ اعلیٰ حضرت غفران مکان لڑاب سیر محبوب علیخان حسردکن ان کو از حد چاہتے تھے۔ محبت کی شریعت میں نسبت بڑی چیز ہے۔ محبوب علی پاشاہ جیسے نیک دل بادشاہ سے ان کی اسی نسبت کے طفیل ان کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ جعفر برہکی سے خلیفہ ہارون رشید کا تعلق خاطر اور سلطان محمود غزنوی کی ایاز سے شیفتگی افسانہ کہن سی مگر حقیقت ہے۔

محمود غزنوی کہ ہزاران غلام داشت
عشق چننا گرفت کہ غلام غلام شد

اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کوئی مورخ اگر شاہ دکن اعلیٰ حضرت ^{علی} ^{محبوب} علی خاں کے حالات زندگی زیب ترطاس کرے اور جمال صاحب میاں کا ذکر نظر انداز کرے تو اس کا مقابلہ تشنہ تکمیل رہے گا۔

محبوب علی پاشاہ نے اپنا انیس و چالیس بنایا بھی تو کسے اور چاہا بھی تو کس کو؟ ایک لاابالی فقیر۔ طبیعت کا ضدی۔ فطرت میں بے نیازی و بے پروائی۔ مگر کسی نے جو یہ کہا ٹھیک ہی ہے کہ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن بھلائے۔ نہ جانے مزاج شاہانہ کو اس قلندر کی کون سی ادا بھاگئی تھی۔ محل میں ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔ ہم لوالہ و ہم سپاہ بنایا۔ سیر و شکار میں اسیر دام



غفران مکان نواب میر محبوب علیخان اپنے جلس جلال میاں کے ساتھ

نوٹہ
 جلال صاحب میاں جو میرزا اس رہتی اہلادہ
 شبکو کہنی چلی گئی ہیں - فوراً تلاش
 کر کے انکو سمجھا کر لیا لالہ بندہ
 کیا جائے - شاید کر غل کی طرف سے
 یا کسی اطلاع کی طرف سے کہہ

عکس تحریر غفران مکان نواب میر محبوب علی خان
 بنام نواب سلطان یاوری جنگ کو تو الی شہر

محبت بنا کے لے جاتے۔ لیکن جمال صاحب میاں نے بھی عجیب طبیعت پائی تھی۔ یوں کہتے کوئی ناز بردار ہو تو ناز کرنے میں بھی مزہ آتا ہے۔ بس غالب کے محبوب کا حال تھا کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جاؤں ہے مجھ سے۔ لیکن کچھ کے محل سے غائب ہو جاتے تو اعلیٰ حضرت غفران مکان بے چین رہتے تھے فرار ہو جاتے۔ کھانا نہیں کھاتے۔ کووال شہر کو فوراً تلاش کرنے کی ہدایت دیتے۔ ہر طرف ہر کاسے دوڑا لے جاتے۔ چنانچہ ایک دفعہ یہ حضرت چچے سے رات کو محل سے چل دیئے۔ سمع ہمالیونی تک اطلاع گزارنی گئی تو حضور عالی مرتبت نے جلدی اور پریشانی میں پینل ہی سے کووال شہر کو دوشتہ لکھا جو راتم کے پاس محفوظ ہے:

نوشتہ

جمال صاحب میاں جو میرے پاس رہتے تھے وہ شب کو کہیں چلے گئے ہیں۔ فوراً تلاش کر کے ان کو سمجھا مٹا کر یہاں لانے کا بندوبست کیا جائے شاید کر لال کی طرف چلے گئے ہوں یا اضلاع کی طرف

شرح دستخط

”سمجھا مٹا کر“ لانے کے الفاظ میں کتنی دل لوازی ہے۔ کیا شان محبوبی ہے کہ ان کے دل کو ٹھیس نہ لگے!

سنہ ۱۳۲۷ھ میں محبوب علی پاشاہ نے اپنے عزیز و محبوب شہزاد

لذاب میر احمد علی الدین علیخان [صلاحت جاہ] کی سالگرہ میں ڈنر پر اپنے خاص خاص امراء کو مدعو کیا تھا۔ اس پُر مسرت موقع پر حضور نے طیف زاد اشعار سنائے جن میں امراء، عہدہ دار اور خاص خاص مساجدین کا ذکر ہے شاہ گدا لواؤز نے انھیں فقیر بے لڑا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ یاد رکھا اور عزت و توقیر کے ساتھ ذکر کیا: آج خوش ہو کر مبارک باد دینے کے لیے

حاضر دربار میں سب ماہاں تیار بادقار

خوش لڑیں خاص جن کے نام میں محمود ہے

اور میاں صاحب جمال نیک دل ذی اعتبار

مہاراجہ کشن پرشاد (سابقہ پیشکار و وزیر اعظم حکومت آصفیہ) نے ایک مختصر سی کتاب ”تدوم سلطانی“ کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں اپنے اور اعلا حضرت غفران مکان کے شکار کے کچھ واقعات لکھے ہیں۔ جمال صاحب میاں بھی اعلا حضرت کے ساتھ ”میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں“ کے مصداق گئے تھے۔ حسبِ عادت کیمپ سے غائب ہو گئے۔ مہاراجہ بہادر نے اس واقعہ کو لکھا ہے جمال صاحب میاں کے تعلق سے یہ ایک اہم اور مستند بیان ہے۔

”چار بجے کیفیت معلوم ہوئی کہ جمال صاحب میاں جو حضرت پیر و مرشد کی بارگاہ میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں اور حضرت کے موردِ عنایت ہیں بطور سیر بلا اجازت اپنے جذبہ شوق میں کہیں چلے گئے ہیں۔ یہ شخص ایک ولی صفت آدمی ہے۔ کم سخن آشنا پرست مگر دوست دشمن سب کے ساتھ ایک ہی برتاؤ۔ نفع اور ضرر کا خیال نہیں۔ دوست سے ملنے کی شادی نہ نقصان کا غم۔ راحت کی قدر نہ مصیبت کی تکلیف سے متاثر شادی وغنی گویا دونوں ایک ہیں۔ آسودہ عشق نہ آلودہ فتنہ۔“

اسی ریاست کے رہنے والے۔ اسی ریاست کی پیدائش۔ پہلی گزران ہوئی تھی۔ جب تقدیر نے پاوری کی تو در بدر سگ ہوسی سے نجات پا کر آستانہ شاہی تک رسائی پائی۔ طبیعت کی خوبیوں کی بدولت مرحمت پر مرحمت بڑھنے لگی۔ قیمت کے ستارے چمک گئے۔ تدم لہوسی شاہ کا فخر حاصل ہوا۔ مقصود کی کچی دستیاب ہوئی۔ انواع و اقسام کی عنایتوں سے عزت پائی۔ صحبت موافق طبع ہوئی تو لطف گرم جوشی رہا۔ بہر حال بارگاہ شاہی میں بار پایا۔ و ما تشاؤون إلا ان یشاء اللہ۔

ان کے گم ہونے کی خبر جو کیمپ میں مشہور ہوئی چار طرٹ دوڑ دھوپ ہونے لگی۔ جاسوسی روانہ ہوئے۔ صید وابستہ کمند شاہی بھی کہیں جانے پاتا ہے بمصداق بلاکشان محبت بہ کوئے یاہو لاوند آستانہ شاہی پر حاضر ہو کر سری ٹیک کی گرچہ دویدم بیسے منزل من کوئے دوست۔ انھیں

اس کی کیا پروا کہ ہوا کیا اور ہوگا کیا۔ یہ فعل مجرمانہ تھا یا راہ صواب کے راہرو تھے۔ جن کسی نے پوچھا میاں! کہاں گئے تھے۔ ہنس کر کہہ دیا کہ ہمارا ملک ہے ہم جہاں چاہیں وہاں رہیں گے۔ کہاں اپنے ملک ہی میں سیر کرنے گئے تھے۔ بخدا اپنے ملک کی ایک کہی۔ سچ ہے جس کا بادشاہ ہو اس کا ملک اس ملکوں نہ ہو۔ الغرض آئینہ رحمت الہی ظل سبحانی نے بخندہ پیشانی ان کی طرف متوجہ ہو کر اپنی خطا پوش نظر سے کام لیا اور اس حرکت سے چشم پوشی فرمائی۔ ”قدم سلطانی صفحہ ۳۴، ۳۵، ۳۶“

محبوب علی پاشاہ ان سے اس درجہ بے تکلفی برتتے تھے کہ امتیاز شاہ وگدا مٹا دیا تھا۔ گویا ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز کی تصویر نظر آتی تھی۔ ایک تصویر میں حضور ان کے زانو پر سر رکھے لیٹے ہیں کسی میں گئے ہیں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ جو تصویر ہے اس کی روایت یہ ہے کہ سرکار انھیں اپنے ساتھ شانہ بہ شانہ کرسی پر بٹھا کر تصویر تروانا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بیپایں ادب و بلحاظ فرق مراتب اس پر ہرگز راضی نہ ہوئے اصرار شاہانہ بڑھنے لگا جس کی تاب نہ لا کر بالآخر کرسی مات مار کر گرا دی اور پچھا پچھڑا کر فرار ہونا چاہتے تھے۔ شاہ عالی قدر کسی نہ کسی طرح ان کی شیردازی کی آستین مضبوطی سے پکڑ کر انھیں اپنے ساتھ بٹھائے رکھا ہے۔ ان کی طبیعت کا اصل جوہر پائیں ادب تھا۔ اعلیٰ حضرت کتنی ہی بے تکلفی سے پیش آتے اور ادب شاہی کو درکنار رکھتے مگر جمال صاحب میاں حد ادب سے سروسیمو تجاوز نہ کرتے اور ”ایاز قدر خود بہ شناس“ کے مصداق و فوالتفات شاہانہ کو دیکھ کر کبھی خود فراموش نہ ہوتے۔

وہ اپنے آقا سے دلی نعمت کی بے لوث رفاقت اور جاں نثاری میں اپنی آپ مثال تھے۔ طبیعت میں حد درجہ استغنا تھا اور کسی چیز کی طمع ان میں نہ تھی۔ وہ اپنی معمولی خدمت پر قانع رہے اور کبھی کسی کی تمنا نہ کی۔ اعلیٰ حضرت غفرانِ سرکان نے انھیں منصب سے فوازا چاہا مگر انھوں نے

نہ کیا۔ جب بھی انہیں بارگاہ خسروی سے کوئی انعام ملتا تو وہ دیوارِ شہر کی نذر کر دیتے۔ یہی اوصاف تھے کہ اعلیٰ حضرت ان کے بے حد رگرویدہ تھے۔

حضرت غفرانِ مکانِ لاذب میر محبوب علی خان کے انتقال [۱۳۲۹ھ] حضرت لاذب میر عثمان علی خان آصف سابع نے اپنے والد کے جلس صاحب میاں کا بہنیاں و لحاظ رکھا۔ شاہی محلِ عدن باغ میں ان کا انتظام کیا۔ دس گیارہ سال مزید وہ زندہ رہے لیکن ان کے گزر جانے کے بعد کسی نے ان کو خوش نہیں دیکھا۔ ہمیشہ افسردہ رہے۔ کبھی بے ساختہ یاد آتی یا کبھی اپنے چاہنے والے کی تصویر دیکھتا تو بالہ ہو کر رونے لگتے۔ دو کس پر ناز کرتے اس لیے محل چھوڑ کر ہیں اور نکلا تو ان کا جنازہ محل سے نکلا۔

آفریں داغ تجھے خوب نہا ہی تو نے
مرحبا کو حبیہ دلدار سے مرکز نکلا

گئے تھے اور ضعیفی میں بھی حفظِ مراتب اور آدابِ شاہی کا ہمیشہ سب ان کی عزت کرتے تھے لیکن وہ فوج اور کمن شہزادے اور کے سامنے بیٹھتے تک نہ تھے۔ ادب سے کھڑے رہتے تھے ان کی کرنا بھی غلاتِ ادب تھا۔

ایتنی تو بہت ہیں لیکن میرے ایک قریب دوست کا چشم دید موصوف نے جمالِ صاحب میاں کو حضورِ آصف سابع کے ساتھ مسجد (بنائے مسجد ۱۳۲۳ھ) میں آتے دیکھا ہے۔ بہت فضیلت۔ اس حال میں واپس ہوتے کہ ایک طرف سے شہزادہ صلابت سری جانب سے شہزادہ بسالت جاہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے ساتھ چلتے تھے۔

ہے کہ اہل علم اصحاب جنہیں تاریخ اور تحقیق سے دلچسپی ہے میری

اس علمی تحقیق کو شش کی اہمیت محسوس کریں گے اور اس خصوص میں مزید معلومات بہم پہنچائیں گے۔ یقیناً جمال صاحب میاں کے ذکر سے غفران مکان کے حالاتِ زندگی کے صحیفے میں مزید ایک باب کا اضافہ ہوگا۔

چبوترہ سید علی

حیدرآباد کے مشہور ادیب و محقق جناب تنکین کاظمی صاحب مرحوم ایک مضمون ”شاہ علی بٹہ“ کتاب ”حیدرآباد کی داستان“ میں صفحہ (۲۱) پر موجود ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے ”راجہ شارج کی دیوڑھی سے آگے نکولی زماں خاں شہید کا مکان، مقبرہ، مدرسہ واقع ہے۔۔۔۔۔ اس مزار کے آگے سید علی چبوترہ ہے۔ یہ بھی ایک بزرگ تھے جو چبوترہ پہمہ فون ہیں“

راقم الحروف اسی محلہ چبوترہ سید علی کا باشندہ ہے اور آباد اجداد تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے اسی بستی میں آباد ہوئے اور یہیں آسودہ خاک ہیں۔ اس خیال سے کہ جناب تنکین کاظمی صاحب جیسے بلند مرتبہ محقق کا بیان کسی غلط فہمی کا باعث نہ بنے، اس لیے تاہ حد علم اظہارِ خیال ضروری سمجھتا ہوں۔

”محلہ چبوترہ سید علی“ ایک قدیم محلہ ہے۔ اس کے مشرق میں محلہ خزانہ جل پل مغرب میں محلہ شکر گنج و غازی بٹہ، جنوب میں محلہ علی آباد اور شمال میں محلہ بازار روپ لال جیسے قدیم محلے آباد ہیں۔ لیکن اس وقت محلہ چبوترہ سید علی کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ متذکرہ محلوں کے نام اس کے آگے ماند پڑ چکے ہیں۔ ہر جگہ چبوترہ سید علی کا سکہ چلتا ہے۔

”تاریخِ دکن“ مؤلف محمد نصر اللہ خاں مطبوعہ ۱۲۸۵ھ بارہ سو پچاسی ہجری میں حیدرآباد کے قدیم محلہ جات کی فہرست موجود ہے۔ اس میں محلہ چبوترہ سید علی کا نام درج ہے۔ لگویا آج سے ایک سو تیس (۱۲۳) سال پہلے اس

محلہ کا نہ صرف وجود تھا بلکہ یہ حیثیت محلہ اس کی شہرت ہو چکی تھی۔ میرے پاس اس مقام کی ایک زمین کے ہبہ نامہ کی نقل موجود ہے جو سنہ بارہ سو چوہین (۱۵۵۲ھ) بمطابق مکمل پایا۔ اس دستاویز میں اس محلہ کا نام زینا پور عرف علی آباد بلکہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد بتلایا گیا ہے۔ یہ تو زمانہ کادستور ہے کہ انقلابات زمانہ کے باعث بستیوں کے نام بدل جاتے ہیں۔ ایک نام کی جگہ دوسرے نام کا شہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح محلہ چوہترہ سید علی کا نام محلہ زینا پور کا قائم مقام ہو گیا۔

راقم الحروف کے گھر سے چوہترہ چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ سڑک کے کنارے چھ گز لمبے اور چار گز چوڑے چوہترے کو اسی حالت میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت کھلا چوہترہ تھا نہ چھت مٹی نہ حصار تھا۔ ہم محلے کے بچے اکثر اس چوہترہ پر کھیل کرتے تھے۔ ہر سال دائیسرے بہادر حیدر آباد آتے تو ان کا قیام فلک نمائش میں ہوتا۔ ہم بچے اپنے بڑوں کے ساتھ اس چوہترہ پر بیٹھے دائیسرے بہادر اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کی آمد رفت کا شاہانہ انتظام دیکھا کرتے۔ قدیم زمانے سے آج تک اس چوہترے پر محرم کی چار تاریخ چار علم چار خلیفہ کے نام سے الٹادہ ہوتے ہیں۔ ان کا لباس سفید، پتیل کے ادسط سائڈ کے نیچے اور ہر نیچہ پر ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، حیدرؓ کندہ کیا ہوا ہے۔ نہ ان علموں کی سواری نکلتی ہے نہ پٹھتے ہیں۔ محرم کی گیارہ تاریخ دن کے گیارہ بجے دکن کی زبان میں یہ وہیں ٹھنڈ ہو جاتے ہیں۔ میں نے کئی جہاں دیدہ اصحاب سے پوچھا سب نے یقین سے کہا کہ دنیا بھر میں چار خلیفہ نام کے یہ واحد علم ہیں جو صرف چوہترہ سید علی پر بیٹھتے ہیں۔

پولس ایکشن ۱۹۴۸ء کے بعد فوج کے ایک ذلیفہ یاب میر ریاست علی صاحب محلہ غازی بندہ میں سکونت پذیر ہوئے کئی خوبوں کے علاوہ بڑے متحرک اور مستعد شخص تھے۔ چنانچہ بے کاری کو کارآمد بنانے کے لیے

انھوں نے چاء خانہ کا منصوبہ بنایا اور سید علی صاحب مرحوم کے ایک وارث حبیب حسین صاحب سے یہ چبوترہ دس روپے کرایہ ماہانہ پر حاصل کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چبوترہ کے گرد ہری لکڑی کی جال کا حصار بن گیا اور اوپر مین کا شیڈ بٹھ گیا۔ ۱۶ فروری ۱۹۴۹ء چبوترہ پر ہوٹل قائم کر کے ”واحد گریں رستورنٹ“ کا بورڈ لگا دیا گیا۔ میریاست علی صاحب مرحوم جیسے غنیمت کی نگرانی میں اس ہوٹل کی بڑی شہرت ہوتی یہاں تک کہ چبوترہ سید علی کا دوسرا نام جال کا ہوٹل ہو گیا [مجاہد ایک مشہور ہے] جائیداد کا معاملہ اس انفرافری کے دور میں آمدنی کا سوال اور کشش مٹی۔ اس لیے سید علی صاحب کے در ثانی ملکیت کے لیے نزاع پیدا ہوئی یا خروقت بورڈ میں فریقین کے ادعا کی سماعت ہوئی۔ پانچ سال تک مقدمہ زیرِ درال رہنے کے بعد دقت بورڈ لے حبیب حسین صاحب کے حق میں فیصلہ سنا تے ہوئے چبوترہ سید علی کو عاشور خانہ قرار دیا اور اسے درج رجسٹر اوقات کیا اور قائم شدہ ہوٹل برقرار رکھتے ہوئے حبیب حسین صاحب کو کرایہ وصول کرنے کا مجاز گردانا۔ تقریباً بیس پچیس سال تک میریاست علی صاحب کی نگرانی میں ہوٹل نہایت کامیابی سے چلتی رہی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد کئی اصحاب نے ہوٹل چلانے کی کوشش کی لیکن پنپ نہ سکے۔ ابھی حال میں اس میں میوہ کی دوکان قائم ہوئی تھی چند مہینے بعد یہ بھی بند ہو گئی۔ اس دقت چبوترہ سید علی جال کا ہوٹل نمبر ۵۶۶-۶-۲ بند اور مقفل ہے۔

سید علی صاحب جن کے نام سے چبوترہ قائم ہے محلہ کے مشرفاں میں سے تھے۔ یہ چبوترہ یہ مقام ان کی ملک تھا۔ سید علی صاحب کوئی ولی بزرگ عالم یا شاعر نہ تھے۔ ان کا انتقال اسی محلہ میں ہوا لیکن ان کی تدفین کسی اور جگہ ہوئی۔ اس چبوترہ پر نہ وہ دفن ہوئے نہ یہاں ان کا مزار ہے کیسے کیسے جید علماء، نامور شاعر، فلاسفیہ بزرگ اور امیر امراء اس محلہ میں رہے۔ لیکن قسام ازل سے شہرت دوام کی سند سید علی کے نام لکھی

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار نے

اعظم غفران مکان

نواب میر محبوب علی خان

اور سانپ کا عمل

ناظرین کرام! التماس ہے کہ غلط فہمی گے اوراقِ اُٹھے اور اخبارِ سیاست مورخہ ۱۶-۹-۱۸۷۷ء کے آپ کا کالم ”پردویا“ ایک نظر ڈالیں۔ بحث یہ تھی کہ اعظم غفران مکان نواب میر محبوب علی خان نظام ششم سانپ کا عمل جانتے تھے یا نہیں اور کیا ان کے نام کی دہائی دینے سے سانپ کا ڈہرا نر جاتا تھا بہ معتبر اصحاب نے مخالف اور موافق رائے کا اظہار فرمایا۔ نتیجہ بحث شک و شبہ اور روایتوں کے خارزار میں الجھ کر رہ گئی اور کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔

نواب میر الدین خان المخاطب سکندر یار جنگ ثانی سے میرے والد مرحوم قریبی رشتہ داری رکھتے تھے اور ان کے سانپ کے عمل کے کئی واقعات سناتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ عمل صرف ایک ہی آدمی کو سکھانے کا تھا۔ حضور غفران مکان کو اپنا عمل سکھانے سے ان کے خاندان میں عمل نہیں رہا۔ میرا بھی جی چاہا کہ اس بحث میں حصہ لوں لیکن سوچا کہ یہ بات میرے نزدیک معتبر شہادت ہی لیکن تحقیق کی نظر میں ایک روایت ہی ٹھہرتی ہے۔ الہیہ ’تزکِ محبوبیہ‘ میں صاحبِ تذکرہ نے نواب میر الدین خان کے حالات لکھتے ہوئے اتنا لکھا ہے ”آپ کے پاس ایک عمل سانپ کا ایسا گمہ تاثیر ہے کہ جس کی شہرت تمام حیدرآباد ممالک محروسہ سرکار عالی میں پھیلی ہوئی ہے اور اسی وجہ خاص سے پہلے آپ سے بخوبی واقف ہے“ (دفتر اہل مسلمان)

جب یہ بحث جاری تھی تو میں اس وقت اسٹیٹ آرکائیوز (آئندہ سرکاری) اعلیٰ حضرت غفران مکان لواب میر محبوب علی خان کے فرامین دیکھنے میں مصروف تھا۔ اتفاق کہتے مجھے اعلیٰ حضرت کا حسب ذیل فرمان ملا۔
 اتفاق سمجھئے یا کچھ اور کہ میرے عزیز اور دوست ڈاکٹر دادو اشرف کی رہنمائی اور مہربانی سے اسٹیٹ آرکائیوز میں مثل صیفہ فیئانی نشان ۱۶۳ بعنوان "اشاعت عمل سانیہ" ہدیت ہوئی۔ جو ایک مستند ریکارڈ ہے اس مثل کا پہلا ورق غفران مکان کے حسب ذیل فرمان سے مزیں ہے۔

حویلی قدیم ۱۶ رمضان ۱۳۱۵ھ

مہارا جہ صدر المہام پیشکار صاحب یمن السلطنت سکندر یار جنگ بہادر جو اپنے نام سے ایک اعلان جریدہ اعلامیہ میں شائع کرنا چاہتے ہیں ملفوف ہے معمولی طور سے جریدہ میں شائع کیا جائے۔ انھوں نے مجھے اپنا عمل دے دیا ہے۔ اس بات کی اطلاع مالک محروسہ میں جہاں تک ہو سکے ہر جگہ ہر شخص کو ہونے کے واسطے وہ چاہتے ہیں کہ تمام عہدہ داروں کو اس کی اشاعت کر کے کی تاکید کی جائے۔ آپ اپنے طور سے اس کی تاکید عہدہ داروں کو کرادے سکتے ہیں تاکہ میرے نام سے سب کو فائدہ پہنچ سکے۔

چونکہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے عمل ایسا موثر ہے اور اپنا کام ایسا کرتا ہے جیسا کہ تیرا مکان رستہ و سحر عامل کامل اور اس کو میں نے آدمایا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ خلق اللہ کو ضرور فائدہ بخش ہے اور ہوگا۔

سکندر یار جنگ بہادر کی عرضی مع ملفوفہ جو حال میں آئی وہ بھی ملفوف ہے یکشنبہ ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ شرح دستخط لواب نمین الدین خان اپنی جو عرضی جریدہ اعلامیہ میں شائع کرنے کے خواہش مند تھے۔ اور جس کو وہ حضور کی خدمت میں پیش کیا تھا طویل ہے۔ لیکن وہ بہت دل چسپ اور حیرت انگیز بھی ہے۔

بندگان عالی مقامی مدظلہ العالی

اعلان

ممالک محروسہ سرکار عالی اور تمام اقلیم ہند میں عوام الناس آگاہ ہیں کہ راقم السطور محمد منیر الدین خاں سکندر یار جنگ (مستند پائیک گاہ نواب اکبر خورشید شاہ بہادر مرحوم) کے پاس سانپ بھڑا زہر افدغ کرنے کا نہایت مجرب عمل مدت سے چلا آتا ہے۔

اگر کسی کو کسی قسم کا بھی سانپ کاٹے تو وہ یا اگر وہ بے ہوش ہو جائے تو اس کے ساتھ کا کوئی بھی آدمی کہہ دے کہ تجھے محمد منیر الدین خاں کی قسم و دہائی ہے اگر جانی اس کی اطلاع اس قدر عرصہ کے اندر (ایک ہفتہ سے تین سال تک حسب مناسب) محمد منیر الدین خاں کو دے دوں گا (تو فوراً زہر کا اثر بفضلہ تعالیٰ دفع ہو جاتا تھا۔ مگر شرط یہ رہی کہ اس واقعہ کی اطلاع مجھے مدت مقررہ کے اندر کسی کی زبانی یا بالمشافہ یا اگر سفر دور دراز نہ ہو سکے تو محض بذریعہ تار یا خط دے دی جاتی تھی تاکہ پورے طور سے ہمیشہ کے لیے زہر کا اثر دفع ہو جائے۔ کیونکہ بصورت عدم اطلاع اندرون میعاد زہر کا اثر عود کر آتا تھا۔ اگر اطلاع دی کے واسطے تار یا خط جو بھی بھیجا جائے وہ گم ہو جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ دہائی دینے والے کے لیے حتی الامکان اطلاع دی کی شرط پوری کرنا کافی تھا۔

میں نے اکثر ایسا بھی کیا ہے کہ ممالک محروسہ کے متعدد مقامات میں نیم کے جھاڑوں پر اپنا عمل پڑھ کر دم کر دیا ہے۔ اور نیز عمل پڑھ کر نیم کے جھاڑ نصیب بھی کر دیا ہے یا اپنا عمل دم کر کے پانی چند بار لیون بھی ڈال دیا ہے۔ جواب تک موجود ہیں۔ اگر کسی کو سانپ کاٹے تو وہ یا اس کی طرف سے کوئی آدمی حسب مذکور میرے نام کی قسم و دہائی دے کر کہہ دے کہ اس قدر مدت کے اندر (ایک ہفتہ سے تین سال تک حسب مناسب) مذکورہ نیم کا تیا یا مذکورہ باؤلی کا یا تیا یا جائے گا تو زہر فوراً اتر جاتا ہے۔ اور مدت

معینہ کے اندر پتا منگا کر متاثر شخص کو کھلاتے یا پانی اس باؤلی کا پلانے سے ہمیشہ کے لیے اثر زہر دفع ہو جاتا رہا مجھے اطلاع دینے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اور ایسا ہی کسی نیم کے جھاڑ کی لکڑی پر اس کا پوست نکال کر میرا عمل دم کیا جائے تو اس کا صندل چٹانے اور زخم پہ لگانے سے بھی زہر دفع ہو جاتا رہا۔

میرے عمل کا یہ بھی خاصہ ہے کہ اگر عامل اپنا عمل کسی کو بتا دے اور سیکھا دے تو عمل کی تاثیر منتقل ہو جاتی ہے یعنی سکھانے والے کے پاس عمل نہیں رہتا۔ تمام و کمال سیکھنے والے کو حاصل ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے اس عمل کو بغرض رفاہ عام اپنے اقائے ولی نعمت ^{اعلیٰ}حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ کو بتا دیا اور سیکھا دیا ہے ^{اعلیٰ}حضرت کو میں نے یہ عمل اپنی خوشی و رضامندی سے بخش دیا ہے۔ پس اب یہ عمل میرے پاس نہ رہا۔ ^{اعلیٰ}حضرت کو تمام و کمال حاصل ہو چکا ہے اور ^{اعلیٰ}حضرت نے اس کا امتحان بھی کر لیا ہے۔ لہذا میں بنظر حفاظت نفوس خلائی بذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ آئندہ سے اس عمل کی نسبت قسم و دہائی میرے نام سے نہ دی جائے بلکہ میرے نام کے عوض ^{اعلیٰ}حضرت خلد اللہ ملکہ کے نام ^{اعلیٰ}میر محبوب علی خان بہادر کی قسم و دہائی دی جائے یعنی (مجھے میر محبوب علی خان کی قسم و دہائی ہے) کہا جائے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ وہی تاثیر بقضی الہی ہوگی جو اب تک میرے نام لینے سے ہوتی رہی۔

میں نے اپنا یہ مشہور عمل اب تک کسی کو نہ دیا اور اب ^{اعلیٰ}حضرت کو میری خوشی و رضامندی سے اس لیے دے دیا ہے کہ ^{اعلیٰ}حضرت مرجع عالم ہیں جن سے ہر قسم کا فیض ہزار ہا خلق اللہ کو پہنچتا رہا ہے۔ اور ان ہی سے اس عمل کا فیض بھی عامہ خلایق کو حاصل ہونا میری دانست میں نہایت ادنیٰ و انساب پانیا گیا تاکہ وہ اس عمل کا فیض خلایق کو پہنچا کر عند اللہ ماجور اور خدا ناس مشکور ہوں۔

آئندہ میرے نام کی دہائی یا قسم سانپ کاٹے کو دینے یا مجھے اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قسم و دہائی اعلیٰ حضرت کے نام نامی میر محبوب علیجان کی دی جائے اور ان ہی کو واقعہ کی اطلاع بھی دی جائے۔ اعلیٰ حضرت نے ہجرم خسروانہ یہ انتظام فرمایا ہے اطلاع کے تار یا خط برابر ان کے ہمدست ہوں اس کام کے واسطے اعلیٰ حضرت نے اپنے ایڈ لیکانگ محمد عین الدین خاں ناصر نواز الدولہ بہادر کو مقرر فرمایا ہے۔ اور تاکید فرمادی ہے کہ تار یا خط حسب مذکورہ صاحب کے پاس بھیجے جایا کریں اور دلوڑھی مبارک کے چوبدار کو بھی تاکید فرمادی گئی ہے جہاں سواری مبارک رونق افروز ہو وہاں جس وقت شب میں ہو یا دن میں جو کوئی سانپ کاٹے ہوئے کی اطلاع یا بغیت لائے وہ فوراً اس وقت سمع ہمالیونی تک پہنچادی جائے۔

SM - 420 (ISTB) فناس - 77 (INT)

مذکورہ اعلان حسب خواہش نواب محمد منیر الدین خاں سکندر یار جنگ ثانی اور بموجب فرمان اعلیٰ حضرت خزان مکان نواب میر محبوب علی خاں جریدہ میں شائع نہیں کیا گیا اب اٹھیا سا (۸۸) سال بعد یہ اعلان شائع ہو رہا ہے جو بینی بر حقیقت ہے ایک سند ہے۔ ایک ریکارڈ ہے۔

مذکورہ بالا فرمان اور اعلان سے اب یہ مسئلہ شک و شبہ سے بالا تر ہو گیا ہے اعلیٰ حضرت خزان مکان نواب میر محبوب علیجان سانپ کا عمل جاننے والے تھے اور آپ کے نام کی دہائی دینے سے سانپ کے زہر کا اثر زائل ہو جاتا تھا۔

وِکٹوریہ زنانہ اسپتال

تقریب تنصیب سنگِ بنیاد

رود موسیٰ کے کنارے بجانب جنوب کسی زمانے میں سلطان محمد علی قطب شاہ کے وزیر مرزا محمد امین اصفہانی امین الملک میر جملہ کا ایک باغ تھا جو امین باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ مسرور زمانہ کے سبب باغ کے آثار تو باقی نہیں رہے البتہ اس کا نام برقرار ہے۔ اسی باغ کے وسیع خطہ پر وِکٹوریہ زنانہ اسپتال واقع ہے جس کی تقریب تنصیب سنگ بنیاد تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

یہ اپنی نوعیت کا پہلا دواخانہ ہے جو بعد از حضرت علی گڑھ لڑائی کے لڑائی کے آصف جاہ سائیں بلا لحاظ مذہب و ملت طبقہ نسوان، پردہ نشین خواتین کے لیے قابل و ماہر لیڈی ڈاکٹروں کے ذریعہ ہر طرح کے زنانی علاج معالجہ اور زحمت کی سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے معرّف و موجود میں آیا جس کی کوئی نظیر سلاطین سلف کے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ جب اس عالیشان دواخانہ کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو اس کا سنگ بنیاد بھی طبقہ نسوان ہی کی ایک ذی تربیت شخصیت شہزادی ویلز وِکٹوریہ ہیری کے دستِ خاص سے رکھا گیا۔ اس خصوص میں ایک شاہی تقریب منعقد کی گئی تھی جس کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اس میں جہاں ارائے دست اور راعیان حکومت و عمائد سلطنت کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی معزز خواتین کو بھی شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا جن کے لیے جلسہ گاہ کے قریب ایک علیحدہ خیمہ میں نشست کا نہایت سہولت بخش انتظام تھا۔

یہ اب سے کوئی چوبیس سال پہلے سنہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے کہ ولی عہدہ برطانیہ شہزادہ ویلز (جو بعد میں بادشاہ ہو کر ہنر مجبوس جارج پنجم کہلائے) روایتی

دورہ پر ہندوستان آئے تھے اور اوائل فروری میں ان کے حیدر آباد آنے کا پروگرام تھا جہاں ان کے شاندار استقبال کی تیاریاں کی گئی تھیں بشہر کو ہر طرح آراستہ دیا گیا اور قصر فلک نما کی تزئین و آرائش کی گئی جہاں پہلی مرتبہ شاہی مہمان کے قیام و استراحت کا انتظام دیا گیا تھا اس کے بعد سے اس قصر شاہی کو مہمان خانہ شاہی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۸ فروری ۱۹۰۶ء کو شہزادہ و شہزادی دلیز وارد حیدر آباد ہوئے۔ ان کا شاندار اور پُر تپاک استقبال کیا گیا۔ اس کے دو سب سے ہی دن ۹ فروری کو دکنور یہ زمانہ اسپتال کی تقریب تنصیب سنگ بنیاد شام کے پانچ بجے منعقد ہونے کا پروگرام تھا اور صبح کو سکندر آباد گراؤنڈ پر فوجی پریڈ کے معائنہ کا پروگرام تھا چنانچہ اعلیٰ غفران مکان شہزادہ کی معیت میں سکندر آباد گراؤنڈ پر رونق افروز ہوئے اور فوجی پریڈ شروع ہوئی۔ اس اثنا میں یہ افسوسناک دالم انجیر اطلاع پہنچی کہ سچی کہ جوان سال و عزیز ترین بڑی صاحبزادی نظام النساء بیگم رحلت کر گئیں جو مرضِ دق میں مبتلا تھیں۔ اس لمحہ سواری شاہانہ مراجعت فرمائے قصر شاہی ہی شہزادہ دلیز نے اپنے ہاتھ سے تعزیت نامہ لکھ کر پیش کیا خسروی میں گزارا اور شہزادی جو اس المناک واقعہ سے خود بھی بہت متاثر ہوئی حرمِ سرے شاہی میں پہنچ کر مراسم تعزیت ادا کئے۔ سالار شہر شاہ ذیچاہ کے غم میں شریک رہا۔ ہر طرف ایک ادا کی پھیل گئی۔ قصر فلک نما سے رزید لسی تک گزر کا ہول پر رنگ برنگ روشنی کا شاندار انتظام کیا گیا تھا احتراماً موقوف رہا۔ تمام سرکار شاہی مصروفیات۔ شاہزادی مرحومہ کے سوگ میں منسوخ کر دی گئیں لیکن دکنور یہ زمانہ اسپتال کی تنصیب سنگ بنیاد کی تقریب رفاہ عامہ کے پیش نظر سے بڑی اہمیت کی حامل تھی اس لیے طبع شاہانہ کو اس کی موقوفی یا منسوخی گوارا نہ ہوتی چنانچہ یہ تقریب وقت مقررہ پر بڑی شان و اہتمام سے منعقد ہوئی۔

حبیب پروگرام شہزادہ و شہزادی دلیز، رزید لسی بہادر، جمیع انگریز عہدیدار، فوجی افسر وغیرہ ٹھیک وقت پر امن لباس پہنچ گئے۔ البتہ حضور

پرنس، مدارالمہام، امراء واعیان سلطنت نے شرکت نہیں کی کہ عین اس وقت مکہ مسجد میں جہاں شاہی مقبرہ واقع ہے شہزادی مرحومہ کے آخری مراسم تجہیز و تکفین انجام پذیر تھے۔ جلسہ گاہ میں جب سب بہان اور مدعوین اپنی نشستوں پر متمکن ہو گئے تو تقریب کا بلوں آغاز ہوا کہ رزیدنٹ بہا دم نے ہر زاتیل ہائیں شہزادی ویلز سے آغاز کار روائی کی اجازت چاہی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر گلٹ ناظم طبابت سرکار عالی نے اپنی تحریری تقریر سنائی جس میں زنانہ اسپتال کی ضرورت اور اس کے انتظامات کے بارے میں اپنے خیال و آراء کا اظہار کیا۔ بعد ازاں رزیدنٹ بہادر اعلیٰ حضرت غفران مکان کی نمائندگی کرتے ہوئے تقریر شاہانہ سنانے کی عزت حاصل کی جس میں زنانہ اسپتال کی ضرورت و اہمیت جتاتے ہوئے آنجنہائی ملکہ معظمہ و کٹوریہ قبیرہ ہند کی یادگار میں شہزادی سے دواخانہ کا سنگ بنیاد رکھنے کی خواہش فرمائی گئی تھی۔ شہزادی و کٹوریہ میری نے اپنی جوابی تقریر میں اس پر اظہار خوشنودی کر کے توقع ظاہر کی کہ اس دواخانہ کے قیام سے مستورات کو بہت فائدہ پہونچے گا۔ صاحب تالیف مسیر حیدر آباد نے اس تقریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”بعد ازاں بنیادی پتھر رکھنے کی رسم ادا کی گئی۔ اول بنیاد میں ایک نفرو باکس (جس میں اخبار پائیر، جریدہ اعلامیہ اور مشیر کن و نیز حیدر آباد کے چند طلائی و نفردی سکے بندھے) رکھا گیا اور اس پر شہزادی صاحبہ نے اپنے دست خاص سے پتھر نصب فرمایا۔ کرتی اور چونا رکھنے طشت نفرو تھا“ (۱۵۵۵) تنصیب سنگ بنیاد کی رسم کے بعد ڈاکٹر گلٹ نے سرکاری اور دیگر ڈاکٹر کا پرنس سے تعارف کرایا۔ اس موقع پر شہزادی میری نے پردہ دار خواتین کے خیمہ میں جا کر انھیں شرف تکلم بخشا اور بات چیت کی اس کاروائی کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا اور پرنس اور پرنسس قفر فلک سنا واپس ہوئے۔ اسی روز رات میں منجانب رزیدنٹ بہادر معزز ہمالوں کا رزیدنٹ

میں ڈرنے لگا جس میں پرنس اور پرنس شریک ہوئے لیکن اعلیٰ حضرت غفران مکان نے شرکت نہیں فرمائی اور حکومت کے مدعوین اسراء اور عہدہ دار بھی ڈرنے میں شریک نہیں ہوئے۔ رز ڈیپٹی میں اس حد تک غم کی پاسداری کی گئی کہ روشنی صرف گیٹ سے کوٹھی کے اندر تک محدود رہی۔

آج بھی دواخانہ کی قدیم عمارت کی بائیں جانب ابتدا میں یہ یادگار سنگ بنیاد موجود ہے جس پر حسب ذیل تحریر کندہ ہے:

This Stone Was Laid by Her Royal

Highness The Princess of Wales on

The 9th February 1906

و کٹوریہ زنانہ اسپتال کا نام اب "گورنمنٹ میٹرنٹی ہسپتال" سے بدل دیا گیا ہے جس سے اس دواخانہ کی تاریخی عظمت اور اس کی خصوصی نوعیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ نام بدل دینے سے تاریخی حقیقتیں تو نہیں بدل جاتیں حقوق نسواں کی تحریک مشرق و مغرب میں زور و شور سے جاری ہی لیکن کیا طبقہ نسواں کی فطری شرم و حیا کے پاس دلچاظ کا ایسا علی نمونہ کہیں لٹتا ہے۔

حضور نظام کی اقتدا میں نماز

دید و شبید کہانی - قلم میرا ان کی زبانی

آج سے کوئی ۶۶ سال پہلے ۱۳۳۳ھ میں اعلیٰ حضرت خسرو دکن آصف صالح کے خاص فرمان سے باغ عامہ کی مسجد نئی تعمیر ہوئی تھی۔ جمعہ کی نماز اعلیٰ حضرت سے شہزادوں کے ہالالتزام پہن ادا فرمایا کرتے تھے۔ دُور دراز محلوں سے بھی بکثرت لوگ جمعہ کی نماز اعلیٰ حضرت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ باقی نمازوں میں محدودے چند مصلیٰ ہوتے تھے۔ ایک روز مغرب کی نماز کا وقت شروع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی مسجد میں تین چار نمازی اجماع تھے کہ دفعۃً پولیس کی سیٹیوں

کی گونج میں سواری شاہانہ مسجد کے سامنے سڑک پر جلوہ افروز ہوئی۔ لڑاب
سراٹین جنگ صدر المہام پیشی مبارک ہمسرا ب تھے سرکار والا تیار خرا ماں خرا
مسجد میں داخل ہوئے۔ ایٹن جنگ کو شرف تکلم بخشے ہوئے مسجد کی خوشنما
کی تعریف فرماتے رہے۔ ادھر مغرب کی نماز کا وقت قریب سے قریب
تر آ گیا۔ اتفاق سے امام صاحب بھی نہ ارد تھے۔ موذن صاحب بکھلائے ہوئے
انہیں تلاش کرنے لگے مگر ان کا پتہ نہ تھا۔ موذن صاحب کی پیشانی کو دیکھ
کر حضور پُر لُڑ نے اپنے خاص لہجہ میں موذن کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ
امام نہیں ہے تو کیا نماز نہیں ہوگی؟ یہ کچھ کر سٹالوں کا مذہب نہیں ہے کہ پادری
ی نماز پڑھا مے دوسرا کوئی نہیں پڑھا سکتا۔ اذان دے دی جائے گا ہم میں سے
کوئی پڑھا دے گا۔ پھر اذان ہوئی۔ حضور عالی نے لڑاب سراٹین جنگ کو اشارہ
کیا کہ وہ نماز پڑھا میں کہ وہ ایک متشرع شخص تھے۔ چہرہ بردار بھی خاصی اچھی
تھی۔ لڑاب صاحب نے دست بستہ نہایت ادب سے عرض کیا کہ سرکار امامت
بادشاہ اسلام کا فریضہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوگا کہ سرکار امامت فرمائی، ہم سب
خدام کو سرکار کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوگا۔ اس پر ارشاد

نمازیں اعلیٰ حضرت کا ادب سے کثرت رہنا، آوازیں خشیت اور ارکانِ تمانہ کا
سنبھل سنبھل کر ادا کرنا ان کی خاص ادا تھی۔ ذاتِ شاہانہ کے تعلق سے یہ اپنی
نوعیت کا ایک منفرد واقعہ تھا جس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ مگر یہ
نہ تو کسی مقامی اخبار میں شائع ہوا نہ عوام و خواص میں اس کا شہرہ ہوا۔ بس
چند آدمیوں کے حانظہ میں محفوظ رہا۔

نواب ولی الدولہ بہادر کا سفر حج

دید و شنید کہانی۔ قلم میرا اُن کی زبانی

نواب ولی الدولہ بہادر حیدر آباد کے نامور امراء میں شمار ہوتے تھے۔
کھول روپے سالانہ جاگیر تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ خاندانہ شاہی سے قرابت
کا شرف حاصل تھا۔ حکومت سرکار عالی کے دور میں صدر المہام تعلیمات و
کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ مئے نوشی و عیش کوئی اس زمانہ میں بھی امراء
وُلِ طبقہ کا دلیہ تھا۔ نواب صاحب کے یہاں اقسام کی قیمتی شراب کا دافر
رہتا تھا با این ہمہ نواب صاحب میں دینداری تھی۔ سلسلہ البراءت علیہ کے ایک
عالم سے بیعت تھے۔ اس کو جاذبہ توفیق الہی کا کرشمہ کہیے یا شیخِ طریقت کا
توجہ کجے نواب صاحب میں یکایک حج بیت اللہ کا داعیہ پیدا ہوا۔ وہ
سے مسکرات و محرمات سے تائب ہوئے۔ شراب کا سارا ذخیرہ پانی کی
دیا اور شراب کے تمام شیشے اور برتن توڑ دیئے اور اپنے مقدس سفر پر
ئے۔ نواب صاحب کو دراع کرنے کے لیے دیوے اسٹیشن حیدر آباد
امراء نیز دوست احباب کا ایک جمع غفیر تھا۔ بہادر احمد کن پرشاد ان
قریب تھے۔ جب میلان میں نواب صاحب سوار ہونے کو تھے بہادر احمد
کا مشہور شعر جو ایسے موقعوں پر عام طور پر پڑھتے ہی پڑھنا چاہا۔ ایک مصرع
سفر رفتنت مبارک باد پڑھا تھا کہ نواب ولی الدولہ نے جھٹکے

اپنا ہاتھ مہاراجہ کے منہ پر رکھ دیا اور کہا کہ آگے مت پڑھیے۔ اس کا دوسرا
مصرعہ تھا "سلامت روی و باز آئی" ! عرض کہ لڑا صاحب حیدر آباد سے روانہ
ہو کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ عمرہ ادا کیا اور سیدھے مدینہ مبارکہ حاضر ہو کر روضہ
اقدس کی دالہانہ زیارت کی۔ کیا عرض و نیاز ہوئے اللہ ہی کو علم ہے۔ اور ابھی
ایام حج شروع نہیں ہوئے تھے کہ لڑا صاحب رحلت کر گئے اور جنت البقیع میں
پیوند زمین ہوئے۔ قرآن کی خاتون جنت حضرت سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا
کی نزد مطہرہ کے پائین میں ہے۔ لوح نزار پر صرف دل الدولہ کندہ تھا۔ ایک مدت
بعد یہ لوح نزار غائب ہو گئی۔ حیدر آباد میں جب انتقال کی خبر پہنچی تو ان کے تحت
دفن ترکہ تعطیل دے دی گئی چنانچہ تمام مدارس کو اسی وقت چھٹی دے دی گئی۔

حیدر آباد کے تاریخی واقعات شاعری میں

جناب عمر خالدی صاحب فرزند محترم ابوالنصر محمد خالدی صاحب مرحوم سابق
استاذ تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ ابھی چند دن پہلے امریکہ (پوسٹن) سے اپنی والدہ
محترمہ کی قدم بوسی اور اپنے دوست و احباب سے ملاقات کی غرض سے اپنے
وطن حیدر آباد مختصر قیام کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ بصورت کو تاریخ کا ذوق اور
تحقیق کا جذبہ اپنے والد مرحوم سے ورثہ میں ملا ہے۔ امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے
وطن عزیز حیدر آباد کی تاریخ یہاں کے آثار اور روایات سے ایسا دالہانہ عشق
ہے کہ انھوں نے کئی بیش بہا محققانہ مقالے اور مضامین لکھے ہیں جو کتابی صورت میں
زور طبع سے آراستہ بھی ہوئے۔ اگرچہ قیام عارضی اور مختصر ہے لیکن اپنے لمحات کو
سیر و تفریح اور نشاط انگیز محفلوں میں ضائع کئے بغیر اپنے آپ کو تحقیقی کاموں

میں رات دن مصروف رکھے ہوئے ہیں۔

اخبار سیاست سورجہ ۵ جولائی کی اشاعت میں بعنوان مندرجہ بالا ان کا بہت دل چسپ اور تاریخی مضمون شائع ہوا ہے۔ یقیناً یہ اشعار ہماری شاعری کا یادگار سرمایہ ہیں۔ اگرچہ شاعر کالب دلچہ جذبات کے اظہار میں بہت تیز و تند ہے اور اسی لیے شاید بعض طبائع نازک پر گراں گزریں لیکن فردوسی طوسی نے اپنے طبقہ شعراء کی خوب وکالت کی ہے:

چون شاعر بہرِ رُخبد بگوید ہجا
بماند ہجا تا قیامت بحجا

جناب عمر خالدي صاحب کا مضمون دیکھ کر میں نے بھی ماضی کے چند گم شدہ اوراق الٹنے کی کوشش کی ہے:

[۱] اعلیٰ حضرت نواب سیر عثمان علی خاں آصف سابع بحیثیت بادشاہ پہلے پہل ۱۹۱۱ء ملک معظم (برطانیہ) کے جشن تاجپوشی میں شرکت کے لیے دلی تشریف لے گئے تھے رمایا کی خواہش تھی کہ بادشاہ کو اس جشن میں کامل احتیاط اور اعلیٰ سے اعلیٰ خطابات ملیں۔ شاعر نے اپنے شعر میں ان ہی خواہشات کی ترجمانی کی تھی۔

نہر مجبئی بن کے اب سرکار دلی سے پھریں

تاج شاہی پہنیں جشن تاجپوشی سے پھریں

اعلیٰ حضرت آصف سابع تخت نشین ہونے کے بعد حکومت برطانیہ سے اپنے حقوق منوانے اور غصہ کئے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے سلسلہ جنسانی شروع کر دی چنانچہ رزیدنی کا علاقہ، ملک برار اور مچھلی بندر کے حصول کے لیے برٹش گورنمنٹ سے جرأت مندانہ گفتگو کا آغاز کر دیا۔ رزیدنی کا علاقہ چند محلوں پر مشتمل تھا۔ اس علاقے پر انگریز رزیدنٹ کا اقتدار نا واجبی اور غیر قانونی تھا۔ برٹش گورنمنٹ نے بالآخر حضور نظام کے ادا کو تسلیم کرتے ہوئے سو سال بعد [۱۹۵۷ء] یہ علاقہ حضور نظام کے حوالے کیا۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کا

ذکر یوں کیا ہے :

خدا کا شکر ہے ہاتھ آگئی رزیدنسی

برار کے لیے زمین بلا رسائی کا

[۲] وسط ہند کے زر خیر خطہ صوبہ برار کو ذاب ناصر الدولہ نے ۱۵۳۳ھ میں کشتیجٹ کے قرض کی ادائیگی میں حکومت برطانیہ کے حوالے کیا تھا۔ لیکن انگریزوں نے اس پر اپنا اقتدار جمایا۔ شاہان آصفیہ نے ملک برار کی واپسی کے لیے بڑی کوششیں کیں لیکن حکومت برطانیہ نے ٹال مٹول کی پالیسی اپنائی اور آخر کار برار کو واپس کرنے سے انکار کر دیا جس پر نظام ذاب میر عثمان علی خان نے بڑی حوصلہ مندی سے معاہدہ برار کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنی مملکت کا جزء لانفیک قرار دیا۔ برٹش گورنمنٹ سے بات چیت کے لیے اپنی حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار سر اکبر حیدری کو مقرر کیا۔ سر اکبر حیدری نہایت لائق اور سیاسی شخص تھے لیکن انگریزوں کی ڈیلوٹھی اور مسکارانہ سیاست کی وجہ سے کام ناکام ہو گیا البتہ صرف اس حد تک کامیابی ہوئی کہ برٹش گورنمنٹ نے نظام کو ملک برار کا بادشاہ تسلیم کیا اور دلی عہدہ ذاب اعظم جاہ کو "پرنس آف برار" کا لقب اختیار کرنے کی اجازت ملی۔ یہ بھی طے پایا کہ ایک عہدہ دار حکومت حیدرآباد کی جانب سے برار میں ایجنٹ برار کے نام سے مقیم رہے گا۔ تاریخ میں اس معاہدہ کو "استراد برار" کے نام سے یاد کرتے ہیں حالانکہ ملک برار کا سارا انتظام حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا حیدرآباد میں ایک طبقہ نے سر اکبر حیدری کی اس کارگزاری کو سراہا لیکن ایک طبقہ الیسا بھی تھا جو انھیں انگریزوں کا ایجنٹ قرار دے کر ان کی مخالفت کی۔ ایک جلسہ بھی حیدرآباد میں ہوا۔ بعض اشخاص نے سر اکبر حیدری کے خلاف نظمیں لکھیں اور ان کو جلسہ میں تقسیم کیا مگر پولیس والوں نے ان پر چون کر چھین لیا۔ ان نظموں کے چند شعر پیش ہیں جن میں شاعر نے اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے :

[۱] زبان خلق

ہو گئی اب یہ حقیقت آشکار
حیدری نے کھودیا ملک برار
ایسی شاہی سے فقیری ہی بھلی
بادشاہت ہے مگر بے اختیار
کیا یہی سننے کے تھے ہم منتظر
کیا اسی دن کے لئے تھے بے قرار
جو گیا ہاتھ سے وہ تو گیا
ہے جو باقی اس سے رہے ہو شیار
گردفاق آیا تو محبوب گیا
دولت و حبابہ چشمِ عز و قار
آکے فیڈریش تب ہی لائے گا
ملک کے دشمن خدا کی تجھ پر مار
تو دکن کی سلطنت کھونے کو ہے
میر صادق دوسرا ہونے کو ہے

[۲]

ترے فریب وفا سے واقف ہیں ہم کو شرہ سنانے والے
بلا ہے کس کو برار نادان یہاں کوئی بے خبر نہیں ہے
دفاغوشی میں ملاقات نکلا بڑا ہی چوبند و حیاق نکلا
عدو کو اس کا یقین ہی تھا کہ حیدری بے ہنر نہیں ہے
تو اپنی سازش کی کامیابی پہ شاد و مسرور ہو رہا ہے
ہوں کیسے مسرور ہم دکن میں وطن کا قلب و جگر نہیں ہے
لگا کر کھا ہے اک اور بھنڈا یہ پُر خطر ہے وفاقی دھندا
دکن کی عظمت کے پاس نافہماری یہ نہ گزر نہیں ہے
یہ پارساتی یہ خضر صورت پھر ایسے کر لوت اللہ اللہ
یقین ہے اب تو ہر مصفیرو کہ حیدری راہ میں نہیں ہے
۱۳۱ء سر علی امام (موتید الملک) پٹنہ کے متوطن تھے جب حضور نظام نواب
میر عثمان علیخان نے کامیابی نظام قائم کیا تو سر علی امام کے خدمت برائے گورنمنٹ
سے حاصل کئے اور انھیں کامیابی نظام کا پہلا صدر اعظم بنایا۔ وہ ایک لاکھ پانچ سو

اور قابل اڈمنسٹریٹر تھے۔ ایک عرصہ سے حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی کا چکر چل رہا تھا اگرچہ سر علی امام نے ملک کی ترقی کے کارآمد اسکیمات بنائیں لیکن ان کی اصول پرستی رنگ لائی اور انھیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ ان کی واپسی پر حیدرآباد کے کسی ضلع کے ایک دل جلے شاعر نے آٹھ قطعات لکھے تھے :

- [۱] حیدرآباد دکن میں اس سال ہوئی شادی عجب محرم میں
ہر بشر کی زبان پہ ہے یہ سخن صدر آعظم گئے جہنم میں
- [۲] صدر آعظم سے حکومت چھین گئی حیدرآباد دکن میں غل ہوا
عدل کی تبدیلی پھر روشن ہوئی اور چراغ ظلم آخر غل ہوا
- [۳] حیدرآباد سے سوئے پٹنہ جن گھڑی سر علی امام گئے
غیر ملکی ہوئے بہت غمگین بولے ملکی نمک حرام گئے
- [۴] ملک میں آئی تھی بلا کالی جس نے چھینی تھی اس کی خوشحالی
ہو گیا آخر اس کا اتصال بطفیل شبہ ہمالیوں وال
- [۵] علی امام نے کھولا تھا ظلم کا دفتر ذلیل و خوار کیا ملکوں کو چن چن کر
لٹایا یاروں پہ اپنے خزانہ شاہی نہ ان کو خوف خدا تھا نہ آخرت کا ڈر
- [۶] شمالی ہند سے نالا قبول کو بلوایا افردان کو عہد دیئے ذمہ داری کے اکثر
نکالا ملکوں کو یا کہ سوت تنگ کیا تلف حقوق کئے ان کے بے ہراس و خطر
- [۷] رعایا فاقوں سے مرنے لگی تھی قحط سالی سگر تھا عیش کا سامان علی امام کے گھر
غلو ہوا انھیں تاراستی میں اس درجہ زمین ملک کی غیروں کو بخش دی بلو کر
- [۸] تھے غیر ملکی یہ پایا خطاب ملکی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہو گئے وہ ملک بد
غرض یہ حال تھا کہ ان کا اپنے دادا پڑھی تھی فاسخ حلوئی جی کی دکان پر

ہمارے آقا سلامت رہیں ہزار برس
ہزار آئیں گے اور ہوں گے ایسے ملک بد

مولوی محمد علی صدر ناظم پولیس اضلاع نے مستند پیشی نواب اظہر جنگ کو اپنے خط کے ساتھ یہ قطعات بھیجوائے اور انھوں نے ان قطعات کو حضور نظام کے

ملاحظہ میں پیش کر دیئے۔ اعلیٰ حضرت ان اشعار کو دیکھ کر بہت برا فرختہ ہوئے اور حکم دیا کہ ”اس بارے میں اول مددگار کو تو الیٰ ونکت را مار پیڑی و ناظم پولیس اضلاع کو میں نے بالمشافہہ حکم دیا ہے کہ دونوں مل کر اپنے اپنے حدود میں پتہ لگائیں کہ ان اشعار کا لکھنے والا کون ہے اور یہ اشعار کس مطبع میں شائع ہوئے ہیں یا نہیں اور جس صورت میں لکھنے والے یا والوں کا پتہ معلوم ہو جائے تو ان کو زیر حراست لے کر تجھے اطلاع دی جائے تاکہ اس بارے میں حکم مناسب صادر ہو سکے اور آئندہ دوسروں کو ایسے حرکات کرنے کی جرأت نہ ہو۔“

شرح دستخط

۱۲ محرم الحرام ۱۳۴۱ھ

ان اشعار کے لکھنے والے شاعر کا نام معلوم ہوا نہ کہیں اس کا پتہ چلا لیکن اس کے قطعات آج بھی آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈز قسط نمبر [۸۰] لسٹ نمبر (۲) اور نشان سلسلہ نمبر (۶۵) پر باقی و محفوظ ہیں۔

[۴] سر اکبر حیدری صدارتِ عظمیٰ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے اور ان کی جگہ ۱۹۴۱ء میں حافظ احمد سعید خان نواب چھتاری صدر اعظم حکومت حیدرآباد ہوئے مشہور ہے کہ چڑھتے سورج کی پوچا جاتی ہے ڈوبتے سورج کی نہیں یوں بھی کسی شاعر کی ترقی کے لیے اس کے عرض معروضہ کی کوئی شنوائی سر اکبر حیدری نے نہیں کی تھی اس لیے نئے صدر اعظم کی آمد کی تہنیت میں جو اشعار شاعر [صدق جالسی] نے لکھے وہ اس کے چوٹ کھائے ہوئے دل کی پکار ہے۔

قطعه

اک دن کسی ملکی نے اک آزاد سے پوچھا آن شوم کہ دی، حاکم ما بود مگر رفت
اب عادل و باذل کی حکومت کے ہی ڈنکے آن حاکم اول یہ سفر یا یہ سفر رفت
آزاد تو آزاد تھے بے ساختہ بولے مارا چہ از میں قصہ کہ گاؤ آمد و رفت
ملکی نے کہا اٹھ کے کہ یہ ارشاد ہے بیجا سال است و ہمیں غالب کہ خیر آمد و رفت
[۵] پولیس ایکشن ۱۹۴۸ء سے پہلے اخبار ”وقت“ حیدرآباد دکن کا ایک مقبول
عام اردو اخبار تھا۔ دراصل اس دور کے مجلس اتحاد المسلمین کا نمائندہ

روزنامہ تھا اس کے ایڈیٹر جناب عبدالرحمن رئیس صاحب بڑے بے باک اور جذباتی ایڈیٹر تھے کارپورازان حکومت کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے نہیں چھوکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اخبارِ وقت بند کر دینے کے احکام جاری کر دیئے۔ لیکن مجلس کی نمائندگی اور کچھ عوامی مطالعہ پر چند ماہ بعد دوبارہ اخبارِ وقت کی اجرائی کے احکام دیئے گئے اس خوشی میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں دکنی زبان کے مقبول شاعر جناب نذیر دہتانی نے ایک رباعی سنائی تھی جو چالیس سال گزرنے کے بعد بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ بے شک گیارہ وقت ہاتھ آتا نہیں لیکن نذیر دہتانی نے جس سادگی و پُرکاری سے بات میں بات لکالی ہے وہ قابلِ داد ہے:

تذکرہ وقت کی انسان بنا دیتا ہے
وقت سوئی ہوئی قسٹ کو جگا دیتا ہے
وقت یہ وہ نہیں دہتانی نہ آئے جا کو
لاکھ کوشش کرو وہ آگود کھا دیتا ہے

بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد

تاریخ شاہد ہے کہ شاہانِ وقت، روسا اور امراء نے ہمیشہ بلا لحاظ مذہب و ملت علماء، شعرا اور فنکاروں کی بڑی قدردانی اور سرپرستی کی ہے۔ ان کے ان ہی کارناموں کے نقوش تاریخ کے صفحات پر مرقم ہیں۔ مغلیہ دور کے بعد عادل شاہی، برید شاہی، نظام شاہی، قطب شاہی بادشاہوں اور جیاگر کے راجاؤں نے بھی علم و فن کی ترقی میں جس فراخ دلی سے حصہ لیا ہے اس کی روداد تواریخ اور شعرا کے قصیدوں میں محفوظ ہے۔

غور طلب اور تعجب کی بات یہ ہے کہ دکن کی مذکورہ بالا بادشاہتیں صدیوں بڑی شان و شوکت سے قائم رہنے کے باوجود ان کے دفاتر کا کوئی

اور وہی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے جس کی وجہ سے بعض خود ساختہ اور مضحکہ خیز واقعات جو دماغی اختراع کے سوا کچھ نہیں بادشاہوں سے کر دیئے گئے ہیں جن سے اس دور کی تاریخیں خالی ہیں۔

ملکت آصفیہ حیدرآباد سالت میں برصغیر کی سب سے بڑی اور ترقی یافتہ ست تھی۔ علم و ادب کی سرپرستی اس کا طرہ امتیاز تھا۔ شاہیر علم و فن ہند سے کھنچ کھنچ کر حیدرآباد آتے اور تاجداران آصفیہ کی علمی معارف و آرازی سے مشرف اور فکر معاش سے مطمئن ہو کر گران قدر ات میں مشغول رہتے تھے۔ جن کی شہرہ آفاق تصانیف سے ایک تنقید ہو رہا ہے۔

لی حضرت غفران مکان لذاب میر محبوب علیخان آصف سادس اور حضرت عثمان علیخان آصف سابع نے نہ صرف ان شان دار روایات کو برقرار اپنی علمی فیاضوں کی ایسی حیرت انگیز مثالیں قائم کیں جن کی نظیر سلطان نہیں ملتی۔ ان بادشاہوں کے یادگار کارنامے یقیناً تاریخ کا قیمتی ہجراج بھی محققین و مورخین کی دسترس میں ہیں۔ ان تاجداروں کے مت کا باضابطہ مکمل سرکاری اور وہی صدقہ ریکارڈ یعنی تمام سرشتہ امثالہ رفاہی اور علمی فیاضوں کی روداد، احکام و فرامین اور لاکھوں تاریخی اسناد و کاغذات آج بھی آندھرا پردیش اسٹیٹ میں محفوظ ہیں۔ نامی گرامی مقامی و بیرونی علماء شاہیر ادب، شہر مال کی قدردانی و سرپرستی ان بادشاہوں کا ولیہ و مہم ہے جو تاریخ ل کارنامہ ہے جن کی تفصیلات بہت دلچسپ حیرت انگیز و افزائیں۔ انہوں نے انقلاب زمانہ نے ریاست حیدرآباد کی کٹ دی اور اہل زمانہ کے لیے یہ سب گئی گزری ہوئی بھولی بھری ہیں۔ تاریخ کا یہ بیش قیمت سرمایہ لاکھوں امثالہ کے انبار میں دبا ہوا ہے موجودہ دور کے محققین اور ریسرچ اسکالرز بہت کچھ فائدہ

اٹھا سکتے ہیں۔ اگرچہ بعض علماء کے تذکروں میں حیدر آباد کی علمی فیاضیوں اور اہل علم کی شاہانہ حوصلہ افزائیوں کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ اتنا مجمل اور تشنہ تحقیق ہے کہ اس سے حیدر آباد کی علمی سرپرستیوں کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔ یہ خوشی کی بات ہے اور قابل مبارکباد ہیں جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب ریسرچ آفیسر آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز جنہوں نے اس گنج مخفی سے آنحضرت آصف جاہ صاحب کی بے مثل فیاضانہ اور شاہانہ سرپرستیوں کے آثار موتیوں سے اپنی بیش بہا تالیف ”بیرونی مشاہیر ادب اور حیدر آباد“ مزین کر کے مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولوی مرزا ہادی رسوا جیسے نامور مورخ و ادیب اور فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے مشہور زمانہ شعرا پر تحقیقی مضامین کی شکل میں ملک کو ایک نادر تحفہ دیا ہے اگرچہ ان مضامین کا دائرہ ان مشاہیر کی حیدر آباد سے وابستگی، سلسلہ ملازمت یہاں قیام اور پھر وظیفہ پر غلطی تک تفصیلی روداد اور ان کے علمی و ادبی کام کے لیے شاہانہ سرپرستی اور گران قدر وظائف اور بعض ضمنی واقعات تک محدود ہے لیکن ان سارے واقعات کو بڑے حسن و خوبی اور وضاحت سے آرکائیوز میں محفوظ ریکارڈ سے مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔

قابل مؤلف نے صرف ریکارڈ ہی دیکھ کر مضامین نہیں لکھے ہیں بلکہ ان تمام مشاہیر شعر و ادب کی سوانح عمریوں اور تذکروں کا مطالعہ بھی کیا ہے نیز ان سے متعلق لکھے گئے تحقیقی مقالوں اور مضامین کو بغور پڑھا ہے اور پھر آرکائیوز ریکارڈ کی روشنی میں ان کو جانچا، پرکھا اور ان غلطیوں اور فردرکاتوں کی نشان دہی کی جو دالتہ یا نادالتہ خود ان شخصیتوں یا ان کے مقالہ نگاروں سے سرزد ہوئی ہیں۔ اگر وہ بعض غلطی ہائے مضامین سے پردہ نہ اٹھاتے تو غلط فہمیوں کی وجہ اصل حقائق پر دہ خطائیں رہتے۔ مضامین کے آخر میں مشاہیر کی درخواستوں، بعض ضروری ریکارڈز اور فراہمین کے زیر افسوس (عکس)

بھی پیش کر دیئے ہیں اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے استفادہ کے لیے
اشملہ اور ریکارڈ کے نمبر و نشان بھی بتا دیئے ہیں۔

بعض ایسی سخن گسترانہ باتوں کا انکشاف بھی قابلِ ملاحظہ کو کرنا پڑا جو
بیان نہ ہوتیں تو حقائق سامنے نہ آتے۔ مثلاً جناب جوش ملیح آبادی نے اپنی مشہور
و معروف سوانح عمری ”یادوں کی برات“ میں ریاست حیدر آباد میں اپنی آمد
ملازمت اور پھر ریاست حیدر آباد سے اخراج کے واقعات بہت سنجیدگی سے
اپنے شخصی کردار کو ایک فیاض اور علم پرور بادشاہ کے مقابلہ میں نمایاں کرنے
کی کوشش کی ہے لیکن جناب جوش سے متعلق دو مضامین ”جوش ملیح آبادی
کی دارالترجمہ میں ملازمت“ اور ”جوش ملیح آبادی کا ریاست حیدر آباد سے
اخراج“ میں پیش کردہ ریکارڈ اور اس معافی نامہ کو جسے جناب جوش نے
حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا تھا پڑھ کر جوش کی غلط بیانی کی قلعی کھل
جاتی ہے۔ لوگ فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جاتے ہیں لیکن جناب جوش ملیح آبادی
خود اپنے لکھے پر پکڑے گئے ہیں۔

ان مشاہیر شعروادب کے سوانح حیات پر محققین نے تحقیقی کام کیا ہے لیکن
زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ سے ثابت ہے کہ ان کے تحقیقی مقالوں میں حیدر آباد
میں ان کے قیام کی مدت اور ریاست حیدر آباد کی جانب سے ان کی علمی خدمات
پر جو گرانِ نذر و نطائف ملتے تھے اس کا ذکر کسی میں نہیں۔ حالانکہ مولانا ظفر علی
خان کار ریاست میں قیام بقول ناضل مولف نصف صدی سے زیادہ رہا اور
مولانا عبدالحمیم شرر نے یہاں چودہ سال گزارے! اور شاہانِ الطاف
و عنایات سے بہرہ مند بھی ہوئے یہ ناسپاسی نہیں تو اور کیا ہے کہ سیرت نگار
نبویؐ مولانا سلیمان ندوی اور مولف حیات سلیمانی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ
وسلم کی تالیف کے سلسلہ میں ریاست حیدر آباد کی بیش بہا امداد و اعانت
کے بارے میں کہیں ذکر نہیں کیا۔

مولانا شبلی نعمانی سے متعلق دو مضامین بطور خاص بہت اہم اور معلومات

ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ معلومات منظر عام پر آئے ہیں جو اب تک محققین کی نگاہوں سے مخفی تھے۔ یہ انکشاف اہل حیدرآباد کے لیے باعثِ فخر و مباہات ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم تصنیفی کارنامہ کی سعادت بھی دولتِ آصفیہ کے حصہ میں آئی۔ مورخ اسلام و عالمِ دین مولانا شبلی نعمانی اور ان کے لائق شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل و تدوین چھ جلدوں میں کی۔ اس عظیم الشان تصنیف کی تکمیل کے لیے آصف سابع نے جس فراخ دلی اور جوشِ ایمانی سے ان کی اعانت کی اور امداد دی ہے وہ تاریخ کا لاثانی کارنامہ ہے ان مصنفین کو ان کے علمی و تحقیقی پراجکٹ کے لیے چودہ سال تک ان کے شایانِ شان وظائف سے سرفراز کیا گیا اور پھر ان کی ذات کے سوالن کے قائم کردہ دارالمصنفین کو بھی ماہانہ مستقل وظیفہ جاری رہا۔ لیکن یہ بھی بڑے تعجب کی بات ہے کہ خود مولانا سلیمان ندوی صاحب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول اور جلد پنجم کے دیباچوں میں فرمانِ ردائے بھوپال سلطانِ جہانگیر کی شاہانہ امداد (دو سو روپے ماہانہ) کا ذکر تو بہت عقیدت مندانہ اور شاندار الفاظ میں کیا ہے اور حضور نظام آصف سابع کی فیاضانہ امداد کا بول ہی سرسری ذکر کیا۔ گویا ان کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔

ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد حضور نظام عالی مقام آصف سابع کی شخصیت کے چند پہلو ا جاگر ہوئے ہیں۔ وہ ایک خود مختار بادشاہ ہونے کے باوجود کوئی حکم نافذ کرنے سے پہلے ہمیشہ اپنی کونسل (مجلس وزراء) کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے اور کونسل کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اگرچہ بادشاہت تھی مگر طرزِ حکومت جمہوری تھا۔ قدر دانی علم و فن کا یہ حال تھا کہ جنابِ فانی بدایونی کو ملازمت دینے کے لیے خود اپنے ملکی قانون کو نظر انداز کر کے استثنائی حکم دیا۔ سب سے زیادہ متاثر کن بات یہ ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کے دوران حکومت ہند نے رینڈ پیٹ کے ذریعہ مختلف پھالوں سے دارالمصنفین کی امداد جو

حکومت سرکار عالی کی جانب سے جاری تھی، مسدود کرنے کے لیے آصف صاحب پر دباؤ ڈالا لیکن آپ اس کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے اور ریڈیٹنٹ کو یہ اطلاع دینے کا حکم دیا کہ جن کام کی تکمیل کے لیے دارالمصنفین کو رقم دی جا رہی ہے وہ ایک مذہبی کام ہے اس امداد کو روکا نہیں جاسکتا! اس زمانہ میں جب کہ انگریزوں کا اقتدار عروج پر تھا برطانوی ارباب حکومت کو ایک والی ریت کا بے ہاشمہ جواب دینا قوت ایمانی کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر آصف صاحب کے جوشِ ایمانی اور جرأتِ مندانہ اقدام کی ستائش کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ آج کے دور میں کون نہیں جانتا کہ ماتحت حکومتیں کوئی ایسا اقدام کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتیں جس سے ان کی ہائی کمان کی پیشانی پر بیٹریں ہیں، (صفحہ ۱۳۳) ان تمام مضامین کے پس منظر میں اور پیش کردہ ریکارڈ کے آئینہ میں وہ تمام تنقید لنگر اپنے اصلی روپ میں نظر آتے ہیں جو حضور نظام کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی متعصبانہ ذمہ داری کو ششیں کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ مشتمل نمونہ از خروار سے ہے درنہ آرکائیوز کے مصدقہ ریکارڈ میں حضور نظام کے آئین حکومت میں عدل و انصاف، رعایا کی خوش حالی اور بھلائی کے لیے ان گنت اسکیمات پر عمل آوری اور اطاعتِ دہش اور بلا لحاظ مذہب و ملت امداد کی ایسی روشن مثالیں ملیں گی کہ آج کے جمہوری دور میں بھی ان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

فاضل مولف نے گزارش احوال واقعی میں آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ ریکارڈ کے ذخائر اور ان کی تاریخی اہمیت و نوعیت کا تعارف بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا ہے۔ خاص طور سے آصف جاہی دؤ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا بیان بڑا اہم ہے کہ تقریباً دو سو ۲۰ سال کی مدت پر یہ ریکارڈ محیط ہے اور ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ایک کروڑ ہے (صفحہ ۹) کتاب قانون کی سیر کرنے والوں اور

آرکائیوز ریکارڈز سے ناواقف حضرات کے لیے یہ ناقابل یقین بات ضرور ہے مگر مولف نے ایک ذمہ دار ریسرچ آفسیر کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔

جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب کو علم و ادب کا شوق اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے جیسا کہ اپنے پیش لفظ میں محترم جناب عابد علی خان صاحب نے بتایا ہے کہ میدانِ ادب میں وہ نووارد اور نوآموز نہیں ہیں لکھنے کا شوق اور تحقیق سے دل چسپی انھیں شروع سے رہی ہے جب وہ ایم اے میں زیرِ تعلیم تھے تو شاعر انقلاب مخدوم محی الدین کے حالاتِ زندگی کمی نشستوں میں خود مخدوم سے دریافت کر کے مرتب کئے۔ ان کا یہ مقالہ ۱۹۶۸ء میں ”مخدوم ایک مطالعہ“ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا جس کی خود مخدوم نے تعریف کی تھی۔ اس طرح مخدوم پر ان کا یہ مقالہ ایک مستند کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی دوسری کتاب ”اور کچھ بیان اپنا“ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی جو ان کے تنقیدی اور نثری تقریروں کا مجموعہ ہے اور ان کی ناقدانہ صلاحیتوں اور شعروادب کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتی ہے۔ فاضل مولف کو اپنی اس گران مایہ اور قابلِ قدر تالیف کے دوران جن صبرِ آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا ان کا اندازہ کرنے سے ہم قاصر رہتے اگر وہ خود اس کا اظہار نہ کرتے۔ آغاز کتاب میں گدازش احوال واقعی“ کے زیرِ عنوان وہ لکھتے ہیں :-

”ادب میں مستند اور مکمل تحقیق کے نمونے پیش کرنے اور ان دیکھے گوشوں پر سے پڑے پروں کو ہٹانے کے لیے بڑی ریاضت اور عرق ریزی متقاضی ہوتی ہے اور پھر حیا بن، تصدیق اور توشیح اور تجربہ و تقابل کے لیے خاص منطقی اور سائنسی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ تلاش خود ایک ریاضت ہے“ (ص ۱) ان کے اس بیان کے بعد اس تالیف کی قدر و اہمیت بڑھ جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کس قدر

سے لکھی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے محکمہ کے ایک ذمہ دار عہدہ دار ہیں سکریٹری
خاتم دہی کے ساتھ ساتھ وہ طالب علموں اور ریسرچ کا کام
کی نہایت مستعدی اور خوش اخلاقی سے رہبری اور مدد
ہتے ہیں۔ اتنی گران یا مصروفیات کے باوجود ایک ایسی اہم
کا معرعن وجود میں آنا معجزے سے کم نہیں۔

لیفٹ جن مضامین پر مشتمل ہے وہ جب یکے بعد دیگرے حیدرآباد
مقبول عام روزنامہ سیاست میں شائع ہوتے رہتے تو بیش تر
لی خواہش تھی کہ ان کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو تو بہتر
، خود ناضل مولف نے یہ ضرورت محسوس کی اور ان مضامین کو
یقے سے ترتیب دیا اور حیدرآباد کی چھ ماہ سالہ تقاریب کے
، ملک خاص کراہل علم و تحقیق کو ایک گران قدر علمی تحفہ دیا۔
حقیقی کتاب کی اشاعت جیسا کہ ناضل مولف نے لکھا ہے محدود
جہ مشکل بلکہ محال تھی مگر جناب عابد علی خان صاحب ایڈیٹر روزنامہ
اور جناب محبوب حسین جگر صاحب ہائینٹ ایڈیٹر کی حوصلہ افزائی
لوازی کی وجہ سے ادارہ سیاست کی جانب سے نہایت نفا
سے شائع ہوئی ہے۔

مفید دور سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک خوش آئند
کہ جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو
کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ روزنامہ سیاست میں اس
آرکائیوز ریکارڈ سے مزید تاریخی یادگار مضامین شائع ہوئے
امید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور آئندہ سال نو کا
کی ایک اور تالیف ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔

شاہانِ بے تاج پر ایک نظر

محترمہ وحیدہ نسیم صاحبہ برصغیر ہند و پاک کی مشہور شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ حیدرآباد دکن میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئیں لیکن تین ماہ کی عمر میں اورنگ آباد منتقل ہوئیں۔ یہیں پر دان چڑھیں۔ حیدرآباد کے اسکول اور جامعہ عثمانیہ جیسی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہوئیں۔ تقسیم ہند اور سقوط حیدرآباد کے بعد ۱۹۵۲ء پاکستان منتقل ہو گئیں۔ ابھی دو ماہ قبل ستمبر ۱۹۸۸ء میں ایک طویل مدت کے بعد اپنے وطن حیدرآباد تشریف لائیں تو آپ کے استقبال میں شاعرے اور ادبی محفلیں ہوئیں۔ دکن کے موقر اردو اخبار ”سیاست“ میں یہ اعلان نظر سے گزرا کہ حضرت منتخب الدین زرداری بخش ”(اورنگ آباد) کے عرس ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء کے موقع پر آپ کی تصنیف ”شاہانِ بے تاج“ کی رسمِ اجراء عمل میں آئی۔ جو اورنگ آباد کے بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کے تذکرہ پر مشتمل ہے تو محترمہ وحیدہ نسیم جیسی بلند پایہ ادیب اور افسانہ نگار کے جادو و رقم قلم سے لکھی گئی کتاب ”شاہانِ بے تاج“ پڑھنے کے شوق بے حد سے مجبور ہو کر فوراً ہی ہم نے ایک مہربان دوست کے ذریعہ اورنگ آباد سے کتاب منگوائی۔ کتاب پڑھنے سے پہلے رہ رہ کر دل میں خیال آتا رہا کہ ایک شاعرہ اور افسانہ نگار کو اولیائے کرام کے حالات لکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ دل میں تجسس آمیز خواہش کی لہر بھی یہ دیکھنے کے لیے مضطرب رہی کہ ایک افسانہ نگار کا شوخ و بے باک قلم ان تقدس مآب ہستیوں کے حالات لکھتے ہوئے ہدایت کی پابندیوں اور تحقیق کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوا ہوگا! لیکن ہماری ساری غلط فہمی محترمہ کے پیش لفظ اور دوسری تحریر سے دور ہو گئی۔

محترمہ نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ جن صوفیاء اور اولیاء کی خاک پا کے صدقے میں میری مشیت خاک کندن بنی وافر عقیدت بن کر ان کو شاہان بے تاج کے نام سے موسوم کر کے ان کی سوانح حیات کا آغاز کر رہی ہوں۔ (ص ۱۱) پہلے تو محترمہ نے اورنگ آباد جیسی اولیاء اللہ سے معمور مقدس زمین میں آنکھیں کھولیں۔ سن شعور کو پہنچیں تو گھر کا ماحول بزرگوں کی کرامت اور عقیدت مندوں سے آباد تھا۔ سینہ بہ سینہ جو کچھ سنا بچپن ہی سے ذہن میں محفوظ رکھا۔ خاص طور سے آپ کے حقیقی خالو حافظ نصیر احمد علوی صاحب محکمہ اوقاف اورنگ آباد کے مہتمم تھے۔ نادر کتابیں اور انوکھے نسخے سب سرکاری طور سے علوی صاحب کی تحویل میں تھے۔ اپنے ان خالو صاحب کے بارے میں محترمہ لکھتی ہیں ”وہ خود شریعت کے پابند تھے اور بزرگان دین کے خلاف کسی غلط بیانی کو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔“ (ص ۱۹) ظاہر ہے محترمہ نے ان ہی اپنے قابل اعتماد قریبی بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔ محترمہ نے سنی ہوئی باتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اولیائے کرام کے سوانح حیات کی دریافت میں تاریخ کے اوراق پارینہ اکٹھا کئے، تصوف کی کتابیں اٹھائیں اور آثارِ قدیمہ کے گم شدہ باب تلاش کئے (ص ۱۹) جب انھیں ۱۹۸۷ء میں پبلش ہو گئی تو انھوں نے شاہان بے تاج جیسی کتاب تصنیف کی راتم الحروف کے والد مرحوم بڑے عقیدت مند مرید حضرت خواجہ محمد حشمتی اورنگ آبادی کے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب کے عرس کے موقع پر ہر سال ہمارا لوہا گھر اورنگ آباد جاتا تھا اور ہمارا قیام مہینہ دو مہینے درگاہ شریف میں رہتا۔ خواجہ صاحب کا نزار و گنبد مشہور و معروف بزرگ حضرت شاہ لورحموی کے گنبد کے پہلو ہی میں واقع ہے۔ اور کبھی رشتہ دار حضرت خواجہ صاحب کے مرید تھے۔ اس لیے میں نے بچپن ہی سے ان دو بزرگوں کے واقعات اور کرامتوں کا ذکر سنا ہے۔ حضرت والد فرماتے تھے کہ انھوں نے میرا نام ”نور الدین“ حضرت شاہ لورحموی کے نام پر رکھا ہے۔

کتاب شاہان بے تاج، جب میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے سب سے پہلے بڑے شوق اور جذبہ بے اختیار سے جن بزرگ کے حالات پڑھے۔ وہ حضرت شاہ لوزحمویؒ تھے۔ معلومات میں اضافہ ضرور ہوا لیکن محترمہ کے بعض لوشہ واقعات قابل غور اور محل نظر ہیں۔

اسے میں بزرگوں کا تصرف سمجھتا ہوں کہ ایک مخطوطہ محقر سے چار اوراق کا جو مجھے مل گیا۔ دراصل یہ محترمہ کے خالو صاحب حافظ نصیر احمد علوی صاحب کے مضمون "ہوا النور" کی نقل ہے جسے موصوف نے ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) کو نشر گاہ حیدرآباد کے لیے لکھا تھا۔ اس مضمون کی تفصیل جناب میر رحمت علی صاحب شمس رفیق نے تاریخ ۳ شہر یور ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۵ء) بمقام بنگر خانہ لوزیہ شمیمہ نقل کر کے نقل مطابق اصل لکھ کر اپنے دستخط مشیت کئے ہیں۔ جناب رفیق حضرت خواجہ شمس الدین محمدؒ کے ارادت مند سرید اور حضرت والد مرحوم کے برادر طریقت تھے۔ اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ یقین ہے کہ مضمون کی نقل موصوف نے والد کو دی تھی۔ برسا برس سے یہ خید اوراق پارینہ بیکار پڑے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ آج وہ اتنے کارآمد ثابت ہوں گے۔ محترمہ وحیدہ نسیم کے بیان کی روشنی میں ان کے خالو جناب علوی صاحب کا یہ مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ہمارے پیش نظر جناب عبد الجبار ملکاپوری کا اردو تذکرہ اولیائے دکن (محبوب ذی المنن مطبوعہ ۱۳۳۲ھ) بھی رہا۔ محترمہ نے حضرت شاہ لوزحمویؒ کا حال اور دوسرے اولیائے حالات میں اسی تذکرہ سے استفادہ کیا ہے۔ حضرت شاہ لوزحمویؒ کے بیان میں محترمہ نے عالمگیر کے دیوان (وزیر)

کا ذکر کیا ہے۔ جناب علوی صاحب کے مضمون اور تذکرہ اولیائے دکن میں بھی عالمگیر کے دیوان سے بعض اہم واقعات منوب کئے گئے ہیں۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ مصاص الدولہ شاہ لوزا خاں کے فارسی تذکرہ "آثر الاسرار" کا مطالعہ کریں جس میں عہد مغلیہ کے تمام مشہور و معروف امرا کے

حالات درج ہیں۔ یہ تذکرہ ہماری تحقیق کا اہم ماخذ ثابت ہوا۔ ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی ادیب ہیں نہ محقق۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے محترمہ وحیدہ نسیم صاحبہ کے مضمون ”حضرت شاہ لور حموی“ کو تذکرہ تذکروں کی لکڑی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے نتیجہ میں چند شبہات پیش آئے۔

”حضرت شاہ لور حموی“ اپنے اسی نام سے مشہور خلافت ہیں۔ محترمہ وحیدہ نسیم نے اسی نام کو زیب عنوان کیا ہے۔ تذکرہ اولیائے دکن نے حضرت کا اسم ”شاہ لور محمد حموی“ کہا ہے۔ جناب حافظ نصیر احمد علوی صاحب سابق ہتم اوقاف اورنگ آباد نے حضرت کا نام ”سید لور محمد“ بتایا ہے اور مصام الدولہ شاہ لور خان نے اپنے تذکرہ ”ماثر الامراء“ میں جہاں بھی حضرت کا نام لکھا ہے ”سیال شاہ لور حامی“ لکھا ہے (ملاحظہ ہو ”ماثر الامراء“ مطبوعہ ایٹانک سوسائٹی بنگلہ صفحہ ۲۶۳ کتب خانہ اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش انڈیا) حضرت کے جو حالات درگاہ میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں نام ”سید لور محمد حموی“ ہے۔ سلسلہ بیعت کا شجرہ مجھے مل نہ سکا۔ جس سے صحیح نام معلوم ہو سکتا۔ جناب نصیر احمد علوی صاحب ہتم اوقاف رہ چکے تھے۔ اس لیے سرکاری حوالہ دیکھ کر انھوں نے جو نام لکھا میری دانت میں وہی صحیح ہوگا۔

جناب علوی صاحب نے لکھا کہ علاقہ خراساں کے قصبہ ”حات“ میں حضرت شاہ لور پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے حموی کہتے ہیں۔ آپ کے والد سید شرف الدین بھی قطب حموی کے لقب سے ملقب ہوئے تھے۔ صاحب تذکرہ ”ماثر الامراء“ نے ”حامی“ لکھا ہے۔ وہ اس کی یہ توجہ کرتے ہیں کہ حضرت شاہ لور ”غربا کو جوان سے ملنے آتا حمام کے لیے دو قلوں“ دیتے تھے اس لیے ”حامی“ کے لقب سے ملقب ہوئے۔ لیکن یہاں بھی علوی صاحب کی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ پن چکی اورنگ آباد میں سید شاہ تاج الدین کلنوار ہے۔ جس کے نام کے ساتھ لقب ”حموی“ ہے۔ اور کر لوز میں

سید عبد اللطیف حموی کی درگاہ ہے۔

جناب علوی صاحب نے اپنے مضمون میں بتایا کہ حضرت شاہ نور حمویؒ ۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر ہم اس تحقیق کو درست سمجھیں تو امیر تیمورؒ ۸۰۷ھ کے عہد میں آپ پیدا ہوئے۔ اور عالمگیر کے دور میں ۱۰۷۵ھ وفات پائی۔ اور بوقت انتقال عمر میں سو پچاس (۳۵۰) سال تھی!

محترمہ نے "امانت علی دیانت علی" کو عالمگیر کا مفتی اور معتمد وزیر بتایا ہے۔ (صفحہ ۱۸۳) اسی نام کو صفحہ ۱۸۷ - ۱۸۸ - ۱۸۹ پر صرف امانت علی لکھا اور صفحہ ۱۸۶ یہی نام امانت علی خاں مندرج ہوا ہے۔ مآثر الامراء میں ایسے کسی دذیر کا نام امانت علی یا امانت علی خاں موجود نہیں ہے۔ جو اورنگ آباد میں عالمگیر کے دیوان تھے۔ صاحب تذکرہ اولیائے دکن نے کوئی عہدہ لکھ بغیر صرف یہ بتایا کہ "دیانت خان آپ کے مرید خاص تھے (صفحہ ۱۱۱) جناب علوی صاحب نے بھی اتنا سنایا کہ "دیانت خان عالمگیر کی وزارت کے فرائض انجام دیتے تھے اور حضرت کے مرید تھے؟"

واقعہ یہ ہے کہ مصمّم الدولہ شاہ نواز خان کے مشہور تذکرہ مآثر الامراء میں عالمگیر کے تمام مشہور امراء کا ذکر موجود ہے۔ ہم نے امانت علی کو تلاش کیا وہ تو نہیں ملے البتہ امانت خان۔ امانت خان ثانی۔ دیانت خان۔ دیا خان ثانی کا ذکر یہ بحیثیت دیوان بڑی تعریف و توصیف اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا پایا۔ ہم تفصیل میں گئے بغیر مآثر الامراء سے بقدر ضرورت مختصراً ان امراء کے بارے میں چند جملے لکھنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ان امراء کے نام اور کام کے تعلق سے جو غلط فہمیاں چھٹی ہیں ان پر غور کریں۔

امانت خان - نام میرک معین الدین احمد خوانی اور خطاب امانت خان صاحب تذکرہ مآثر الامراء نے آدھا صفحہ القاب تعریف میں لکھے ہیں۔ عالمگیر جیسے دُور اندیش اور محتاط بادشاہ کے بہت ہی قابل اعتماد امیر تھے۔ امانت و دیانت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ عالمگیر نے امانت خان کے خطاب

ہے کہ مزار و گنبد دیانت خان نے تعمیر کی۔ آثار الامراء سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ کا مزار، گنبد اور خانقاہ دیانت خان ثانی نے بصرہ کثیر تعمیر کرائی۔

محترمہ لکھتی ہیں ”امانت علی (صحیح نام دیانت خان) کو حضرت شاہ لور حموی صاحب سے آتی عقیدت تھی کہ اس نے کسی مجاور سے خواب میں فرمائش کی کہ حضرت شاہ لور حموی صاحب کے مزار مبارک پر کے پھول باہر پھینکے۔ بجائے میری قبر پر ڈال دیئے جائیں چنانچہ اس پر صدیوں سے عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ احاطہ پھولوں سے بھر گیا۔ اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ یہاں کوئی مزار ہے اس کے بعد اس کی صفائی ہوئی۔ مزار برآمد کیا گیا لیکن حضرت شاہ لور حموی کے مزار سے اترے ہوئے پھول اب تک وہیں ڈالے جاتے ہیں“ (صفحہ ۱۹۰)۔

صاحبِ تذکرہ اولیاء دکن اس روایت کے بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ جناب علوی صاحب نے اپنی تقریر میں اس تعلق سے دوسری روایت بیان کی ہے یعنی ”وصیت کی جاتی ہے کہ مزار منور کے پاس اور مرجھاے ہوئے پھول میری تربت پر ڈالے جایا کریں تاکہ تمکنت جہانیاں مرجھاے ہوئے پھولوں کی خاک میں روندی جاتی رہے“ کسی مجاور سے خواب میں آکر خواہش کرنے سے زیادہ موثر اور قابلِ فہم وصیت کرنا ہے جس سے ارادت و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم نے بزرگوں سے سنا بھی یہی ہے۔

محترمہ نے اپنے مضمون میں (صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۹) حضرت شاہ لور حمویؒ کی کرامت کا تذکرہ بڑے دل چپ ڈرامائی انداز سے کیا ہے۔ بیانِ طویل ہے مختصر پس اتنا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے معتبر و معتمد اور مخلص وزیر امانت علی بن دیانت علی (محترمہ نے یہی نام لکھا ہے) کو طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ تیز رفتار گھوڑے پر دلی جلسے اور شاہی محل میں ایک مخصوص جگہ پر رکھے ہوئے شاہی دستاویزات لے کر وہاں

قیام کے بغیر فوراً اورنگ آباد لوٹ آئے۔ امانت علی نے حکم کی تعمیل کی اور دستاویزات لے آئے۔ لیکن ایک اسم دستاویز لانا بھول گئے۔ اورنگ آباد نے امانت علی پر شبہ کیا اور غصہ اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے تین دن کے اندر دلی جا کر دستاویزات لانے کا حکم دیا ورنہ سرفلم کرنے کی دھمکی دی۔ امانت علی سے ناممکن تھا کہ تین روز کے اندر دلی جائے اور دستاویزات لائے۔ وہ بے حد پریشان رہا جب تین دن ختم ہونے کو ایک گھنٹہ رہ گیا تو وہ شاہ نور جموں کی خدمت میں حاضر و قدم بوس ہو کر اپنی مجبوری پریشانی رو رو کر سنائی۔ حضرت نے تسلی دی اور ایک کپڑا امانت علی پر ڈال کر فرمایا کہ تم اپنی دستاویز اٹھا لو۔ کپڑا ڈالنے سے امانت علی کی آنکھوں کے سامنے دلی کا محل کھڑا تھا جہاں جا کر امانت علی نے مطلوبہ دستاویز لے لی اور جب کپڑا ہٹا تو امانت علی کے ہاتھ میں دستاویز تھی؟

ہیں معلوم محترمہ نے متذکرہ روایت کس سے سنی اور کہاں پڑھی۔ البتہ اس کرامت سے ملتی جلتی کرامت کا ذکر تذکرہ اولیاء دکن میں موجود ہے کہ ایک روز شاہ صاحب نے پوچھا دیانت خان اکبر آباد کے قلعہ سے بھی کچھ خبر رکھتے ہیں؟ و فوراً اعتقاد سے عرض کی کہ میں درگاہ خلافت سے خبر رکھتا ہوں۔ باقی تمام سے فراموش ہوں۔ فرمایا جانب قلعہ دیکھئے۔ دیا خان نے حسب الحکم دیکھا کہ قلعہ اگرہ نمایاں ہے اور خاص ان کی حویلی جو دہاں تھی موجود ہے۔ حویلی میں اپنی والدہ کے مقبرے کو بھی دیکھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا دیکھا۔ عرض کی دیکھا۔ بعد ازاں تمام نظر سے غائب ہو گیا۔

(صفحہ ۱۱۶) جناب علوی صاحب نے بھی تذکرہ اولیاء دکن کی اس روایت کی ہمنوائی کی ہے۔ میں نے بھی اپنے بزرگوں سے اس تعلق سے ایک اور ہی روایت سنی ہے۔ بچپن میں سنی ہوئی یہ روایت اس ضعیف العمری میں بھی اچھی طرح یاد ہے۔ مگر اب اس کے بیان کرنے سے کیا حاصل۔ ہم بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی کرامتوں کے سبحان و دل قائل ہیں لیکن

ہمیں پیروں کی کرامت کا سودا نہیں ہے۔ ہم اپنے تجربہ کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ”حقیقت روایات میں کھو گئی۔“

محرّم نے اپنی بیان کردہ کرامت کے واقعہ کے سلسلہ میں انکشاف کیا کہ اورنگ زیب عالمگیر صفوی سرمد کے قتل کے سبب بے حد پریشان ہوئے اور ان کے دل کا سکون ختم ہو گیا تھا۔ جب لہات علی کی زبانی شاہ نورحموی کی کرامت سنی تو وہ فوراً شاہ نورحموی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سکون دل کی دُعا کے طالب ہوئے۔ محرّم لکھتی ہیں ”سرمد شہید کا خیال تمہیں کہیں چین نہیں لینے دیتا“ آپ کی یہ نرم اور دھیمی آواز شہنشاہ ہند کا دل چیر گئی۔ فوراً اس مرد خدا کے قدم پکڑ لیے۔ اس کے بعد شاہ نورحموی صاحب نے اس کو اپنے پیروں کی خاک چٹا کر یہ کہا کہ اب تمہیں اس بستی میں قرار آ جائے گا۔“ صفحہ (۱۸۹) اورنگ زیب کو حضرت شاہ نورحموی کے پاؤں تلے کی خاک چٹانے کے بعد مزید محرّم فرماتی ہیں ”اس کی موت کے بعد حضرت کی دُعا کے مطابق یہ تاثیر اس کی قبر کی مٹی میں باقی رہی کہ جو بے قرار اس کو کھائے قرار آ جائے۔۔۔۔۔ وہاں کی مٹی کو لوگ اختلاج قلب اور ہول دل کے لیے اکسیر سمجھ کر اب بھی پاتے ہیں۔“ [صفحہ ۱۹۰] واقعی محرّم نے کرامت بعد وفات کا زندہ ثبوت فراہم کیا ہے۔ از کرامات شیخ ماچہ غیب!

جناب علوی صاحب نے جو روایت اپنے مضمون میں لکھی وہ محرّم کے بیان کردہ روایت و کرامت کے بالکل برخلاف ہے۔ ان کی تحقیق میں یہ بات آتی ہے کہ ”انصاف شعار بادشاہ کا نفس معدلت پسند ہر وقت اندر ہی اندر کچھ دیتا رہتا ہے کہ تعمیر اس سلطنت، بھائیوں کے قتل اور بوز بآپ کی نظر بندی سے ہوتی ہے۔ بھائیوں نے تو معرکہ کا بازار گرم کیا لیکن شفیق اور بہادر باپ بیٹے کی سرگرمیوں کو چپ چاپ دیکھا اور مستار ہا اور اسی خاموش زندگی میں دنیا سے چل بسا۔ جوشیلے بیٹے کو معذرت خواہی کا موقع ہی نہیں ملا۔ کپڑے حشر کا خوف دامن گئے ہول سکون قلب جاتا رہا۔

اطمینان خاطر پراگندہ ہوا اور جوش ملک گیری مذامت کے تخیل سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ مملکت مغلیہ کا تاجدار ذی اقتدار طاقت نفس سے پریشان ہو جاتا ہے بڑھے باپ کی بیمار تصویر آنکھوں کے سامنے چھپتی رہتی ہے۔ وزیر باتدبیر شاہ ذی جاہ کے انتشار خیالی سے تدبیر آمیز پیش کی بھینک مانگتا پھرتا ہے۔ اور دنیا لوری میں حضوری کا مشورہ دیتا ہے دیگر امراءے سلطنت بھی تائید کرتے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے قبول فرمایا۔ حاضری کی سعادت حاصل کی۔ ارشاد عالی ہوا کہ کل صبح رات بھر ختم کلام مجید کر کے آؤ۔ بادشاہ نے تعمیل حکم کی۔ شہنشاہ ہند گدے بے لڑا کی کٹیا میں قبل نازِ نجر آیا۔ فرمایا۔ حجرہ میں جا کو دیکھا گو شاہ جہاں مشغول تلاوت قرآن ہے۔ عالمگیر، شاہ جہاں کے قدموں پر گر پڑا۔ رو کر عفو و تھپتھپات چاہی۔ باپ نے بیٹے کی خطا معاف کی اور نور محمد سے توسل چاہا کہ درازی عمر و خوش بختی کی دعا میں بھی دیں۔ عالمگیر چشم منناک لیے حجرے سے نکلتا ہے۔ ملاحت نفس کی سرگرمیاں اشکِ مذامت سے ٹھنڈی پڑ گئیں۔ قلبِ مطمئنہ کی تاریخ دنیا بھر آباد ہو گئی۔ اس کے بعد دنیا جانتی ہے کہ عالمگیر نے کس طنطنہ و شان سے حکومت کی ہے اور نور محمد کے صدقے میں باپ کی دعا بیٹے کے حق میں کتنی مقبول ہوئی ہے۔“

ایک طرف محترمہ وحیدہ نسیم جیسی ادیبہ میں جھولنے نے اولیائے کرام کی سوانح حیات لکھتے کے لیے تاریخ، صوفیہ کرام کی حیاتِ طیبہ کی تلاش اور آثارِ قدیمہ کے گم شدہ باب کو پڑھا جانچا اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا اور پھر حاصلِ تحقیق اپنا لکھا۔ دوسری طرف محترمہ کے خالو صاحب جناب نصیر احمد علوی ہیں جن کی تحقیق پر محترمہ کو اتنا اعتماد ہے کہ وہ خود کہتی ہیں کہ بزرگانِ دین کے خلاف غلط بیانی کو وہ برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ محترمہ اور جناب علوی کے بیانات میں کتنا تضاد اور تحقیق میں بعد المشرقین ہے۔ کیا محترمہ اپنے خالو صاحب کے بیان کو درست سمجھتی ہیں اور کیا جناب علوی صاحب زندہ رہتے تو محترمہ کی تحقیق کو برداشت کر سکتے تھے؟ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس کی

بات پر ایمان لائیں۔ لیکن یہ سچ اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ خداوند ایہ تیرے
سادہ لوح بندے کدھر جائی!

مذکرۃ اولیاء دکن سے معلوم ہوتا ہے کہ ”سید شہاب الدین خلیفہ و
سجادہ حضرت شاہ نور صاحب کے تھے۔ بابیسویں تاریخ شعبان ۱۱۱۹ھ
انتقال ہوا۔ مقبرہ اندرون روضہ حضرت شاہ نور قدس سرہ مسجد کے جنوبی
جانب میں ہے۔ زیارت گاہ خالی و عام ہے۔ ہر سال عرس ہوتا ہے (۱)۔
لیکن جناب علوی صاحب کا یہ بیان بہت اہم ہے کہ ”سید شہاب الدین“ حافظ
قطب الدین اور مولوی غلام نور کی قبریں اندرون احاطہ درگاہ بجانب جنوب
مسجد ایک قطعہ اراضی پر کسمپرسی و گنہامی کی حالت میں تھیں۔ گذشتہ سال حصول
جائزہ کے بعد جب مجھے اس کا علم ہوا تو بڑا دکھ ہوا۔ سابقین اولین کے
نزارات کی یہ حالت لائق حد عبرت مکتبی۔ اسی وقت نواب شہاب الدین خان
اول تعلقدار سے میں نے معروضہ کیا اور درستی کا حکم لیا۔ اب تعویذات قبور
بن گئے ہیں۔ نمایاں ہیں اور معتقدین فاتحہ پڑھ کر کبرتلیں حاصل کر سکتے ہیں“۔

اب محترمہ کی تحقیق کا حاصل ملاحظہ ہو۔ فرمائی ہیں ”خواجہ شہاب الدین
عرصہ تک حیات رہے لیکن ان کا نزار کہاں ہے۔ اس کی تحقیق یوں مشکل ہے
کہ اگر اولیاء دکن کے مصنف کا لکھا درست نہ مانا جائے تو وہ نزار خواجہ شہاب الدین
کا ہے جن کا وصال ۱۱۹۱ھ میں ہوا اور آبداد کے پیرائے لوگ ان کے
دفن میں شریک تھے اور خواجہ شہاب الدین کا نزار نہیں اور تلاش کرنا پڑے گا
اور اگر مصنف اولیاء دکن کا لکھا درست ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شہاب الدین
ہوں جن کی میت کو بعد کو کہیں سے لا کر دفن کیا گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب
محبوب ربانی حضرت خواجہ شمس الدین محمد حسینی آبدنگ آباد دکن کے اولیاء
کیا رہے تھے۔ حضرت شاہ نور جموی کے وہ جانشین تھے نہ خلیفہ۔ حضرت کے
شجرۂ بیعت میں شاہ نور جموی کا اسم گرامی نہیں ہے۔ البتہ وہ حضرت
شاہ نور جموی سے پڑی عقیدت و ارادت رکھتے تھے

اور درگاہ شاہ لور حموی کے سرکار
 کا جانب سے منظم تھے۔ حضرت خواجہ صاحب کا انتقال ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) جمیر میں سجادہ صاحب اجمیر شریف کے مکان میں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ
 میت اجمیر سے اورنگ آباد لائی گئی اور درگاہ شاہ لور حموی میں تدفین
 ہوئی۔ سریدوں اور عقیدت مندوں نے گنبد تعمیر کیا۔ حضرت کا قیام ونگ آباد
 میں محلہ عثمان پورہ میں رہتا تھا۔ جہاں آپ کا مکان تھا۔ انتقال سے آج
 تک ہر سال ماہ جمادی الاخریٰ میں بڑے تفرق و اہتمام سے عرس ہوتا ہے
 جب جناب عبدالجبار ملک پوری نے تذکرہ اولیائے دکن ۱۳۳۲ھ میں
 مرتب و شائع کیا تو حضرت خواجہ صاحب کو دنیا سے رخصت ہوتے وقت
 سات سال ہوئے تھے۔ اگر انھوں نے حضرت خواجہ شمس الدین محمد حسینی
 اورنگ آبادی کے مزار و گنبد کو سید شہاب الدین کا سمجھا تو یہ ان کی ایسی
 تحقیقی غلطی ہے کہ تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اور اگر محترمہ نے بھی تحقیقی
 ذمہ داریوں سے چشم پوشی کر کے صرف اڑسٹھ ۶۸ سال پہلے کے ایک مشہور
 ولی بزرگ کے حالات کو کجا مزار تک سے ناواقف و لاعلم ہیں تو معلوم
 نہیں پانچ سو سال پہلے گزرے ہوئے بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے
 حالات اور کشف و کرامات لکھنے میں کس حد تک تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔
 بہت دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ محترمہ نے معمولی تحقیق میں بھی
 کچھ دل چسپی سے کام نہیں لیا اور حضرت خواجہ شمس الدین محمد حسینیؒ کے خلیفہ
 سید حمایت حسین شاہ صاحبؒ عرف نہنے میاں شاہ جہاں پوری کے مزار
 و گنبد کے بارے میں لکھتی ہیں۔ ”میں نے جب استفسار کیا تو پتہ چلا کہ
 یہ حضرت شاہ لور حموی صاحب کے مجاور کا مزار ہے جن کا انتقال
 حال ہی میں ہوا ہے۔“ (صفحہ ۱۸۴)

اگر محترمہ صحیح طور سے استفسار کرتیں تو یہ معلوم کرنے میں غلطی
 نہ ہوتی کہ حضرت سید حمایت حسین شاہ صاحبؒ کا انتقال سنہ ۱۹۶۵ء

[انیس سو پینسٹھ] حیدر آباد دکن میں ہوا۔ اور ان کی تدفین اورنگ آباد میں اس جگہ ہوئی جہاں آج ان کا مزار و گنبد ہے۔ جسے محترمہ مجادر کا مزار بتا رہی ہیں۔

ہم اپنا یہ مضمون محترم خواجہ حمید الدین شاہ صاحب مدیر ماہ نامہ سب رس کراچی پاکستان کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔ اس التماس کے ساتھ کہ سب رس میں جگہ دیں اور اسی کے ساتھ ہم محترمہ وحیدہ نسیم صاحبہ کے خالو صاحب جناب نصیر احمد علوی کے مضمون کا فوٹو کاپی محترمہ کے ملاحظہ کے لیے یہ توسط جناب شاہ صاحب پیش کرتے ہیں تاکہ محترمہ کچھ لکھیں تو ہم اپنے شبہات دور کر لیں۔

ایک مشہور نا مور پہلوان رستم زماں غلام محمد گاما

گاما پہلوان کے آباد اجداد کا وطن گاما پہلوان کے آباد اجداد | کشمیر تھا۔ کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ کے عہد حکومت میں گاما پہلوان کے دادا ترک وطن کر کے امرتسر (پنجاب) منتقل ہو گئے۔ ذریعہ معاش غالیچوں کی تجارت تھا لیکن وہ خاندانی پہلوان بھی تھے اس فامیوان کے دو پہلوان سلطان پہلوان اور صادق پہلوان ہندوستان کے نامی گرامی پہلوان ہوئے ہیں۔

گاما پہلوان کے والد عزیز بخش پہلوان کا جنم اسی مردم خمیز سرزمین پنجاب میں ہوا۔ کشتی کا فن وراشتہ چلا آ رہا تھا اس لیے عزیز بخش کو بچپن سے پہلوانی کا شوق رہا اور آخر کار وہ اپنی دلچسپی اور محنت سے سترہ سال کی عمر میں ایک بڑے پہلوان بن گئے۔ اور کئی کشتیاں جیت کر شہرت حاصل کی۔

اس زمانہ میں بندھل کھینڈ کی ایک چھوٹی ریاست ”دیتا“ کے راجہ بھوانی سنگھ کو کشتی کا بہت شوق تھا اور وہ پہلوانوں کے قدردان اور مہربان تھے۔ عزیز بخش کشتی لڑنے کے ارادہ اور قدردانی کی اُمید لے کر ریاست ”دیتا“ گئے مہاراجہ بھوانی سنگھ کشتیوں کے مقابلوں میں عزیز پہلوان کی کامیابیاں دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور ازراہ قدردانی ان کو اپنی ریاست میں قیام کرنے پر مجبور کیا۔ ان کا وظیفہ مقرر کیا اور تمام اخراجات کی ذمہ داری لی۔ راجہ بھوانی سنگھ جیسے قدردان راجہ کی خواہش پر عزیز بخش پہلوان ریاست ”دیتا“ میں رہ گئے اور پھر وہیں اس ریاست کے شاہی پہلوان ”لون پہلوان“ کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی۔

گاما پہلوان کی پیدائش اور ان کا بچپن | ”دیتا“ میں پیدا ہوئے ان کا نام غلام محمد رکھا گیا بعض روایت سے غلام حسین پیار سے مال باپ گاما پکا مارتے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ لاڈ و پیار کے نام گاما ہی سے شہرت و دھام ملی اور اصل نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ عزیز بخش اپنے بچہ گاما کو ایک بڑا پہلوان بنانے کی آرزو رکھتے تھے اسی لیے پانچ سال کی عمر ہی میں ان کو کندھے پر بٹھا کر لاکھاڑے لے جاتے تاکہ بچہ کے دل میں کشتی کا شوق پیدا ہو۔ گاما کی عمر چھ سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ان کے نانا لون پہلوان نے ان کو اپنی پرورش میں لیا لیکن چند ماہ گزرے تھے کہ ”لون پہلوان“ کا کسی نزاع میں قتل ہو گیا۔ ان کے ماموں ”عید پہلوان“ نے ان کی سرپرستی کی۔ انھوں نے گاما کو فن کشتی کی تعلیم دی اور گاما کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ ان کے والد عزیز بخش پہلوان اُن کو ایک بڑا پہلوان دیکھنے کے آرزو مند تھے اس لیے ان کو ایک بڑا پہلوان بن کر اپنے والد کی آرزو کو پورا کر دکھانا ہے۔ گاما نے بچپن ہی سے اپنے والد کی خواہش کو پورا کرنے کا عزم کر لیا۔ کھیل کود سے کوئی دل چسپی نہ رکھی۔ صرف پہلوانی اور

ریاست ”دیتا“ کے راجہ کی سرپرستی | گاما پہلوان کے والد کے انتقال
امام بخش ۱۸۸۳ء میں ریاست دیتا ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماسو عید ا
پہلوان اور چچا کلی پہلوان نے ان دونوں بچوں کو اپنی سرپرستی میں لیا لیکن
راجہ بھوانی سنگھ نے اپنی ریاست کے مایہ ناز پہلوان کی دونشا نیوں کو
پردان چڑھالے میں بڑی دل چسپی اور خاطر خواہ حصہ لیا گاما اور امام بخش کے
نن پہلوانی کی تکمیل میں جس فیاضانہ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کا یادگار
باب ہے۔

پہلوانوں کی قدردانی | یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں کشتی اور
پہلوانی کا فن فقط عروج پر تھا ایسی ریاستوں
میں جا بجا اکھاڑے قائم تھے۔ والیان ریاست نے اس فن کی ترقی کے
لیے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انھوں نے پہلوانوں کی
ایسی سرپرستی کی کہ پہلوان کا کام صرف ورزش کرنا اور اپنے فن میں بہار
پیدا کرنا تھا لیکن ورزش کے سوائے مقوی اور بیش بہا غذا کا استعمال
اور پہلوانوں کے دیگر اخراجات اور ضروریات کی تکمیل ریاست کے خزانہ
سے ہوتی تھی۔ کسرت اور کشتی کے مقابلے رکھے جاتے اور مقابلہ جیتنے والے
پہلوان کو بھاری انعامات سے نوازا جاتا تا کہ ان کی ہمت افزائی ہو
اور شوق بڑھے۔

ورزش کا مقابلہ | ریاست جودھ پور کے راجہ جسونت سنگھ نے
قدردان تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے پہلوانوں کی ورزش کے مقابلہ کا
اعلان کیا کہ جو پہلوان سب سے زیادہ بٹھیکیں لگا سکے اسے انعام اول
دیا جائے گا۔ اس کسرتی مقابلہ میں چار سو ۲۰۰ پہلوانوں نے حصہ لیا۔

گاما بھی اپنے مامو بوٹا پہلوان کے ہمراہ جودھ پور پہنچے اس وقت ان کی عمر صرف نو سال تھی لیکن وہ اس کسرتی مقابلہ میں حصہ لینے مجل گئے۔ اتنی چھوٹی عمر میں بڑے پہلوانوں کے مقابل آنا بے جوڑ سی بات تھی لیکن بوٹا پہلوان کی سفارش پر ہمارا جہ نے کمسن گاما کو مقابلہ میں حصہ لینے کی اجازت دے دی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ۹ سال کے گاما نے سب سے زیادہ بٹھکیں لگا کر انعام اول حاصل کیا !

جودھ پور میں قیام اور فن کی تعلیم | جودھ پور کے راجہ نے نو عمر گاما کو روک لیا اور فن کشی کی تعلیم مجھے علاوہ ہر قسم کی سہولت اور ہر طرح کی مدد کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ راجہ جسوت سنگھ کی خواہش کے احترام میں بوٹا پہلوان اور گاما جودھ پور میں ٹہر گئے۔ یہاں گاما نے بوٹا پہلوان اور مادھو سنگھ پہلوان کی نگرانی اور شاگردی میں مسلسل چار سال تک فن پہلوانی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

ریاست دیتا کو واپسی | جب ہمارا جہ جسوت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو گاما اپنے وطن دیتا واپس ہوئے یہاں کے راجہ ان کے منتظر تھے انھوں نے گاما کو اپنی سرپرستی میں رکھا۔ اس وقت گاما کی عمر تیرہ سال تھی۔ اپنے درباری پہلوان عزیز بخش پہلوان کے انتقال کے بعد ان کے دونوں لڑکوں گاما اور انام بخش سے محبت اور ہمدردی ان کے دل میں تھی اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ دونوں ان کی ریاست کا نام روشن کریں گے۔ چنانچہ راجہ نے ان کے نہنے اود کھانے اور ہر ضرورت کی تکمیل کی ذمہ داری لے لی۔ کئی اچھے پہلوان ریاست میں تھے جن کے راجہ سرپرست تھے۔ گاما مزید دو سال یہاں رہ کر فن پہلوانی کے دائرے پر عبور حاصل کیا اور اپنی ذاتی دل چسپی اور محنت سے اس فن میں

کامل دست گاہ حاصل کی۔

گاما کو جب اپنے فنی پرختگی
ہندوستان کے پہلوانوں سے مقابلہ کا ارادہ اور مہارت کا یقین ہو گیا
 تو ان کے دل میں ہندوستان کے پہلوانوں سے مقابلہ اور زور آزمائی کرنے کی
 انگ پید ہوئی اور انھوں نے اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے پورے ہندوستان
 کا دورہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آخر وہ ریاست دیتا کے پہلوان تھے اس لیے
 سب سے پہلے راجہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور ان کی اجازت
 کے طالب ہوئے راجہ کو جب گاما کے اس عظیم ارادہ کا علم ہوا تو وہ
 بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ ان کے سفر
 کے اخراجات اور روزمرہ خوراک کی پابجائی کے کفیل بن گئے۔ دانی
 یہ تھی راجاؤں کی قدردانی اور حوصلہ مندی۔

پندرہ سال کی عمر میں گاما ہندوستان
ریاست دیوان میں قیام بھر کا دورہ کرنے اور پہلوانوں سے

مقابلہ کا ارادہ کر کے ریاست دیتا سے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے
 وہ بھوپال کے قریب ”دیوان“ آئے۔ اس وقت راجہ پرتاب سنگھ اس
 ریاست کے حکمران تھے۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی لیکن راجہ
 پرتاب سنگھ کی فنی کشتی سے دل چسپی اور پہلوانوں کی قدردانی کی وجہ
 یہ ریاست بڑی شہرت رکھتی تھی۔ راجہ پرتاب سنگھ بڑے نیک سیرت
 ابا اخلاق اور حوصلہ مند راجہ تھے راجہ کے حسن سلوک اور قدردانی کی وجہ
 گاما ریاست دیوان میں چار سال تک رہنے پر مجبور ہوئے۔ گاما ہمیشہ اس
 مقام کا اقرار اور ذکر بڑے متاثر کن انداز سے کرتے تھے کہ ان کی سیرت
 تعمیر میں دیوان کے راجہ پرتاب سنگھ کا بڑا حصہ ہے اس لیے وہ
 اب بھی راجہ کا نام لیتے تو عزت و احترام سے لیتے تھے۔ جب راجہ
 پرتاب سنگھ کا انتقال ہو گیا تو گاما ایک بار پھر اپنے وطن دیتا واپس ہوئے۔

نامور پہلوان رحیم بخش گوجرانوالہ سے پہلی کشتی | اس زمانے میں ریاست
دنگل کا اعلان ہوا ہندوستان کے کئی بڑے پہلوان اس دنگل میں حصہ
لینے جونا گڑھ پہنچے۔ گامانے بھی اس دنگل میں حصہ لینے کے ارادہ سے
دیتا کے راجہ ہوانی سنگھ کو آگاہ کیا اور ان کی اجازت چاہی۔ گامانے
راجہ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ وہ ریاست دیتا
کے پہلوان کی حیثیت سے ہی جونا گڑھ کے دنگل میں حصہ لینے کے راجہ نے
خوش ہو کر نہ صرف جانے کی منظوری دے دی بلکہ ان کے اخراجات سفر
اور دیگر ضروریات کی پوری ذمہ داری لے لی۔

پندرہ دن تک یہ دنگل جاری رہا ہندوستان کے شہرت یافتہ
غلام پہلوان کے شاگرد رحیم بخش سلطانی والا پہلوان (گوجرانوالہ) نے
جب ایک بددیگرے پہلوانوں کو شکست دے کر سرفہرست آگئے تو گاما
بھرے دنگل میں رحیم بخش پہلوان کو مقابلہ کا چیلنج دیا جسے رحیم بخش پہلوان
نے قبول کیا۔ ایک ہفتہ بعد کشتی مقرر ہوئی۔ رحیم بخش پہلوان اپنے پورے
دلو ہٹل ہونے کے ساتھ طاقتور، تجربہ کار فن کشتی کے داؤ پیچ سے
واقف مشہور پہلوان تھے۔ اس وقت وہ ریاست جونا گڑھ کے پہلوان تھے
اس لیے نواب صاحب جونا گڑھ یہ مقابلہ دیکھنے دنگل تشریف لائے۔
دونوں پہلوانوں کا مقابلہ مسلسل ایک گھنٹہ ہوتا رہا۔ دونوں نے داؤ
پیچ میں اپنی اپنی جہارت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا کشتی
ملتوی کر دی گئی اور دونوں پہلوانوں کی برابری کا اعلان کر دیا گیا۔

تمام دنیا کے پہلوانوں کو گاما کا حیرت انگیز چیلنج | اپنی اس عظیم کامیابی
کے بعد بیس سالہ
گاما نے یقین محکم کے ساتھ تمام دنیا کے پہلوانوں کو مقابلہ کا چیلنج دے کر
حیرت زدہ کر دیا۔ اس وقت ہندوستان میں خود ایک سے بڑھ کر ایک

فنی کشی میں مہارت رکھنے والے شہ زور، دیو سیکر، اور تجربہ کار پہلوان موجود تھے۔ پنجاب، بکھٹو، گوالیار، بھوپال، ٹیکم گڈھ، دیتا، رلیو، لال بڑودہ اور بنارس کے تمام پہلوان اس چیلنج کا جواب دینے اور مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاما ان پہلوانوں کا مختلف مقامات پر مقابلہ کب اور ہر مقابلہ میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ جن مشہور اور بڑے پہلوانوں نے گاما سے مقابلہ کیا وہ تھے رستم ہند غلام محی الدین چیلوان، بدری برہمن چیلوان، یو پیلوان آگرہ، گاموپانی والا پیلوان (گوندگا پیلوان کے والد) اور حسین ملتانہ پیلوان۔ ان تمام پہلوانوں کی بڑی شہرت تھی۔ چھوٹے پہلوانوں کا کیا شمار یہ سب رستم ہند خطاب رکھنے والے پیلوان گاما کے مقابلہ میں منٹ سے زیادہ نہ ٹہر سکے۔

رحیم بخش پیلوان سے دوسری کشی | اندور کے راجہ شیوجی راؤ ہلکے پہلوانوں کے سرپرست اور بڑے قدر دان تھے ان کی خواہش پر گاما اور رحیم بخش کا اندور میں مقابلہ ہوا۔ راجہ نے بطور خاص انتظامات کئے تھے اور کشتی جیتنے والے پہلوان کو تین ہزار روپیہ کا انعام اعلان کیا۔ گاما اور رحیم بخش کا عظیم الشان مقابلہ مسلسل دو گھنٹے تک ہوتا رہا۔ دونوں پہلوانوں نے داؤ پیچ کی ایک دوسرے پر آزمائش کی اور داؤ پیچ کے توڑ ایسا بے نظیر مظاہرہ کیا کہ جن کی یاد مدتوں دیکھنے والے نہ بھلا سکے۔ آخر ہارجیت کا فیصلہ ہوئے بغیر دونوں پہلوانوں کی برابری کا اعلان کر دیا گیا راجہ نے خوش اور متاثر ہو کر گاما پہلوان کو ان تین کشتیوں کا معاوضہ جواہر نے اندور میں لڑی تھیں ایک لاکھ روپیہ نقد انعام دیا جو یقیناً اس زمانے میں سب سے زیادہ بڑا شاندار انعام تھا۔

دُنیا کے پہلوانوں کو گاما کا چیلنج اور سات ہزار کا پیش کش | بے شمار پہلوانوں سے گاما نے مقابلہ کسی نے بھی ان کو شکست نہیں دی۔ گاما کو اپنے فن پر اور مہارت پر اتنا

اعتماد ہو گیا کہ کلکتہ پہنچ کر دنیا کے پہلوانوں کو ایک بار پھر عجیب نوعیت کا چیلنج دیا کہ جو پہلوان بھی ان کو شکست دے گا وہ اس کو سات ہزار روپیہ نقد ادا کریں گے۔

تین سال کی خاموشی کے بعد جس پہلوان نے چیلنج قبول کیا وہ مشہور پہلوان حسین بخش ملتانہ پہلوان تھا جب کلکتہ میں ان دونوں پہلوانوں کا مقابلہ ہوا تو صرف دو منٹ میں حسین بخش ملتانہ پہلوان چت ہو گئے۔ اس وقت کے انگریز گورنر جو یہ عظیم الشان دنگل دیکھ رہے تھے خوش ہو کر گاما کو ایک قیمتی گرز انعام دیا۔ حسین بخش ملتانہ پہلوان نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کا ماکا لکھنؤ اور پھر لاہور میں مقابلہ کیا لیکن ہر بار ایک دو منٹ سے زیادہ گاما کے مقابل نہ پھر سکے اور انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

گاما پہلوان کے چیلنج سات ہزار روپیہ حسین پہلوان سے تیسری مرتبہ کشتی کے جواب میں پانچ سال بعد لاہور میں رحیم بخش پہلوان نے گاما سے تیسری بار کشتی لڑی۔ یہ ناقابل فراموش کشتی دو گھنٹے بیس منٹ تک زور آرائی اور فن کے مظاہرہ پر برابری پر ختم ہوئی کیوں کہ شام کا دھند لگا چھا چکا تھا۔

۱۹۱۰ء میں ایک عظیم الشان صنعتی لندن کی نمائش میں پہلوانوں کا دنگل | نمائش کا لندن میں انعقاد عمل میں آیا۔ منتظمین نمائش نے یہ طے کیا کہ اس نمائش میں پہلوانوں کا ایک دنگل ہو اور رستم زماں [WORLD CHAMPION] کا خطاب اعزاز اور ٹپکے بطور سند اسی پہلوان کو دیا جائے جو نمائش کے دنگل میں فائنل مقابلہ جیتے۔ اس عظیم الشان بین الاقوامی مقابلہ کا نام ”جان بل چیمپئن شپ“ قرار دیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ دنیا کے تمام پہلوانوں کو اس دنگل میں شرکت اور مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ کشتی گدول پہنچو گی اور

مغربی طرف پر ہوگی جس میں جیتنے والے پہلوان کو مؤدفعہ اپنے مد مقابل پہلوان کو پچھاڑنا لازمی ہوتا تھا۔ جب اس تاریخی دنگل کا اعلان ہوا تو دنیا ہر ملک سے بڑے بڑے طاقتور اور ماہر فن پہلوان ”رستم زماں“ کا اعزاز حاصل کرنے کا عزم لے کر لندن پہنچ گئے۔

گاما پہلوان کی لندن کو روانگی | جب گاما نے کشتیوں کے مقابلہ اعلان دیکھا تو ان کے دل میں آ غظیم الشان دنگل میں حصہ لینے کی خواہش ہوئی آخر کار ان کے ایک دوست سرت کمار نے ان کی مدد کی اور وہ پیرس اور اٹلی ہوتے ہوئے لندن جا پہنچے۔ ان کے ہمراہ ان کے چھوٹے بھائی امام بخش پہلوان، احمد بخش پہلوان اور گاما موہی پہلوان بھی لندن گئے۔

منتظین نمائش کا طریقہ انتخاب | منتظین نمائش نے کشتی کے مقابلہ لیے پہلوانوں کے انتخاب کا ایک

رکھا تھا جو پہلوان ان کے مقرر کردہ قذ، جسم اور وزن (ہیوی ویٹ) معیار پر پورا اتر سکتا تھا اس مقابلہ میں حصہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ دنیا کے ملک سے آئے ہوئے کئی پہلوانوں کا اس معیار پر پورے نہ اترنے کی انتخاب نہ ہو سکا۔ صرف گیارہ پہلوانوں کو ”رستم زماں“ کا اعزاز حاصل کر۔ منتخب کیا گیا۔ منتظین نے گاما کو بھی اپنے معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ دنگل میں شریک کرنے سے انکار کر دیا۔

گاما کی جانب سے پانچ پاؤنڈ کا اعلان | منتظین کے اس طریقہ کار سے گاما پہلوان کو رنج ضرور ہوا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور مالوس نہیں ہوئے کیوں کہ ان کو اپنے فن اور طاقت بھروسہ تھا۔ انھوں نے لندن کے اخبارات میں یہ اعلان شائع کیا کہ دُن

کا کوئی بھی پہلوان ان سے مقابلہ کرنے آئے۔ اگر وہ پانچ سنٹ میں ا شکست نہ دے سکیں تو پانچ پاؤنڈ اپنی طرف سے معاوضہ ادا کریں گے

دنیا کے تمام ملکوں سے آئے ہوئے پہلوان لندن میں موجود تھے۔ گاما کے اعلان کے بعد تقریباً دو سو پہلوانوں نے گاما سے مقابلہ کیا لیکن کوئی پہلوان بھی پانچ پاونڈ حاصل نہ کر سکا۔ لندن کے اخبارات نے گاما کی مسلسل غیر معمولی کامیابیوں پر شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور ان کے کشتی کے فن کی مہارت پر بڑی تعریف کے ادارے لکھے۔

گاما کی لندن میں اتنی عظیم کامیابیوں نے مقابلہ میں انتخاب اس کامیابیوں نے تنظیم کمیٹی کو چونکا دیا۔ وہ اپنے اصول اور معیار انتخاب پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آخر کار ارکان کمیٹی نے گاما پہلوان کو گیارہ میوی ویٹ پہلوانوں میں شریک کر لئے جانے کا اعلان کر دیا۔ سچ ہے:

حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی!

اسٹیڈیم میں کشتیوں کے مقابلے دو ماہ تک ہوتے رہے ہر کھٹ دن بعد مقابلہ ہوتا تھا۔ یہ کشتیاں یورپ کے قاعدے کے مطابق گدول پر ہوتے تھے۔ انگلستان کے قاعدے کے مطابق جیتنے والے پہلوان کو دو دفعہ پچھاڑنا لازمی تھا اور داؤ سے ایسا جکڑنا کہ مد مقابل پہلوان اپنی شکست کا اعتراف کر لے۔ گاما تمام قاعدوں کی پابندی کرتے ہوئے بہت آسانی سے ہر پہلوان کو دو دفعہ فیصلہ کن شکست دے کر ورلڈ چیمپئن شپ کے فائینل میں پہنچ گئے۔ ادھر مغربی دنیا (پولینڈ) کا سب سے بڑا پہلوان اسٹینے زبسکو مسلسل کامیابیوں کے بعد فائینل مقابلہ کے لیے تیار تھا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۸۰ء لندن کے اس اسٹیڈیم میں بڑا کامیابی اور زبسکو کی کشتی | تاریخی یادگار مقابلہ گاما اور زبسکو کا ہوا۔ تمام

دنیا کی نظریں اس کشتی کے انجام پر لگی ہوئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشرق اور مغرب کا وقار اس کشتی کی ہار جیت کے فیصلہ سے وابستہ ہے۔ ابتداء

میں تیس منٹ طاقت اور داؤ پیچ کا مظاہرہ ہوتا رہا اس کے بعد گامانے ایک داؤ ایسا مارا کہ زبسکو نیچے گرے اب کے انھوں نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی پہلوؤں کی اصطلاح میں زمین پکڑ کر لیٹ گئے۔ گامانے زبسکو کو اپنی گرفت میں دلوچ رکھا اور زبسکو کے سارے داؤ پیچ اور زور آزمائی بیکار گئی کشتی شروع ہوئے دو گھنٹے چونتیس منٹ ہو چکے تھے۔ جب زبسکو کو گاما کے گھٹنے کے دباؤ کی برداشت نہ رہی وہ دو گھنٹے نیچے پڑا بلبلا تا رہا آخر کار ریفری سے استعا کی کہ وہ تھک گئے ہیں اور آئندہ ہفتہ گاما سے دوبارہ مقابلہ کریں گے مجلس کی رائے کے مطابق رستم لورپ زبسکو کو ایک موقع دیا گیا اور آئندہ ہفتہ گاما سے زبسکو کی آخری کشتی کا اعلان کر دیا گیا۔

دوسرا ہفتہ اور رستم زماں کا اعزاز | دوسرے ہفتہ ۷ ستمبر ۱۹۱۷ء زبسکو اور گاما کا دوسرا فیصلہ کن مقابلہ

اس اسٹیڈیم میں شروع ہونے والا تھا اس تاریخی کشتی کو دیکھنے پورا لندن لوٹ پڑا تھا۔ ٹھیک تین بجے گاما اور زبسکو کے مقابلہ کا اعلان ہوا۔ گاما فوراً اکھاڑے میں پہنچ گئے لیکن زبسکو لاپتہ تھے تمام بار بار لپکا را گیا۔ آخر کار ریفری نے گاما کا ہاتھ اُدیر بلند کر کے ان کے ”رستم زماں“ ہونے کا اعلان کیا اور فتح مندی کا نشان بطور سند ایک ہزار ایک گاما کی کمربانڈھا اس ٹیکہ پر یونین جیک کا نشان لگا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

گاما پہلو ان رستم زماں کی | ہندوستان کو واپسی
ہندوستان لوٹنے سے پہلے گاما نے لندن میں دنیا کے تمام پہلوؤں کو مقابلہ کا چیلنج دیا لیکن کسی کی ہمت ان کے سامنے آنے کی نہ ہوئی۔

ہندوستان اس وقت غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ایک محکمہ قوم کے فرد نے آقاؤں کے دیں میں بغیر سرپرستی فتح اور کاسرائی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے اس لیے جب وہ ہندوستان لوٹے تو ان کا ہر جگہ پُر جوش اور شاندار استقبال ہوا اخباروں نے ادارے لکھ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

لندن سے آنے کے بعد
دو پہلوانوں سے مقابلہ

گاما جب لندن سے پانی کے جہاز میں آ رہا
تھے تو جہاز میں پھسل کر گر پڑے تھے اور
گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پاؤں صرت
لمبا رکھ سکتے تھے موڑ نہیں سکتے تھے۔ سخت تکلیف تھی۔ لیکن ہندوستان آنے کے
بعد پنجاب کے دیو ہیکل دو پہلوان نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ گاما کے ساتھیوں
نے رائے دی کہ علاج کر داکر مقابلہ کریں۔ لیکن گاما نے مشورہ کو نظر انداز کیا اور
کہا کہ وہ مقابلہ کریں گے تاکہ دنیا یہ نہ کہے کہ گاما نے لڑنے سے جی چیر لیا اور
بچنے کی کوشش کی۔ لاہور میں یہ کشتی ہوئی۔ کشتی شروع ہوئی تو صرف دو منٹ
میں دو پہلوان زمین پر چلت تھے۔

رحیم بخش پہلوان کو حیرانوالہ
سے جو حقیقی کشتی

گاما رستم زماں تو ہو گئے تھے لیکن رستم ہند نہ ہو سکے
کیوں کہ رحیم بخش پہلوان سے ان کی تین دفعہ کشتی
ہوئی اور ہر بار مقابلہ برابری پر ختم ہوا۔ دنیا
کا ہر پہلوان گاما کے مقابلہ میں منٹ دو منٹ سے زیادہ نہ ٹھہر سکا صرف رحیم
بخش پہلوان ہی ایسے تھے جن سے گاما نے دو دو گھنٹے مقابلہ کیا اور کوئی ہار جیت
کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ میں گاما نے دنیا کے تمام پہلوانوں کو مقابلہ کا چیلنج
دیا تھا۔ گاما کے چیلنج کے جواب میں رحیم بخش پہلوان نے مقابلہ کا اعلان کیا۔
بارہ سال کے وقفہ کے بعد ۱۹۱۱ء میں الہ آباد کی ایک صنعتی نمائش کے
ڈنگل میں دو عظیم پہلوانوں گاما اور رحیم بخش پہلوان کا سامنا ہوا۔ پینتیس منٹ
کی زور آزمائی کے بعد گاما نے اپنے پُرانے حریف رحیم بخش کو ایسا بچھاڑا کہ
وہ ڈنگل میں چاروں طرف خلع چلت تھے۔ اس طرح رحیم بخش کی فیصلہ کن شکست
کے بعد گاما نے بجا طور پر رستم ہند کا خطاب بھی حاصل کر لیا۔

گاما کا ریاست پٹیالہ میں قیام

جب لندن میں کشتیوں کا عظیم الشان ڈنگل
۱۹۱۰ء میں ہوا تھا تو ریاست پٹیالہ کے
مہاراجہ راجہ بھوپندر سنگھ اس زمانے میں لندن ہی میں تھے۔ انھوں نے گاما اور

ان کے بھائی امام بخش کی کشتیوں کے کامیاب جہت، انگیز تھا بلوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور متاثر ہوئے تھے۔ جب راجہ ہندوستان لوٹے تو انھوں نے گاما اور اما بخش پہلوان کو پٹیلہ آنے کی دعوت دی اور ان سے خواہش کی کہ گاما اور ان کے بھائی امام بخش مستقل طور پر پٹیلہ میں قیام کریں اور اپنے اہل و عیال کو بھی وہاں بلا لیں۔ چنانچہ گاما نے راجہ کی خواہش کا احترام کیا اور پٹیلہ میں سکونت اختیار کی۔ راجہ نے گاما اور ان کے بھائی کا ڈھائی ڈھائی سو وظیفہ مقرر کر دیا اور رہنے کے لیے ایک اچھا مکان مفت، نایت کیا راجہ بھونیدر سنگھ کشتی کے بڑے قدر دان اور دل دادہ تھے اس فن کو ترقی دینے اور پہلوانوں کے ساتھ جو قدر دانی انھوں نے کی اس کی مثال نہیں ملتی۔

ریاست پٹیلہ میں راجہ کی سرپرستی میں چالیس پہلوان موجود تھے اس ریاست کے پہلوان چندن سنگھ کی بڑی شہرت تھی۔ راجہ کی خواہش پر گاما نے چندن سنگھ پہلوان سے کشتی لڑی۔ گاما کو چندن سنگھ کے چت کرنے میں تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

زبسکو کی گاما سے دوسری بار کشتی لڑنے کی شکست کا بدلہ لینے پولینڈ کے چمپئن زبسکو اٹھارہ سال بعد ۱۹۲۸ء پٹیلہ آئے

جہاں راجہ کی سرپرستی میں گاما مقیم تھے زبسکو کا خیال تھا کہ اس طویل عرصہ میں گاما ضعیف ہو چکے ہوں گے اور ان کے وہ کس بل باقی نہ ہوں گے مہاراجہ پٹیلہ نے اذراہ قدر دانی زبسکو کو آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ چالیس ہزار روپیہ دینے کا بھی اعلان کیا۔ گاما نے اس چیلنج کو قبول کیا اور جو شرائط زبسکو نے رکھے سب منظور کئے البتہ گاما نے صرف ایک شرط رکھی کہ لال ٹی پر کشتی ہوگی۔ جسے زبسکو نے تسلیم کر لیا۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ وہ گاما کو اب کی بار بہت آسانی سے زیر کر لیں گے۔ کشتی دیکھتے ڈیڑھ لاکھ تماشا کشی موجود تھے جب کشتی شروع ہوئی تو پلک جھپکتے ہی زبسکو زمین پر چت تھے۔ گاما نے

اپنے ایک انٹر ویو میں اس کشتی کے بارے میں کہا تھا کہ جس نے گھڑی دکھی اور جس نے سگریٹ سلکایا اس نے کشتی نہیں دیکھی۔

جب مہاراجہ پیٹالہ فرانس گئے تو گاما اور پٹرسن رستم فرانس کا مقابلہ | وہاں کے دیوہیکل مشہور پہلوان پٹرسن نے ان سے ملاقات کر کے بتایا کہ لندن کے ورلڈ چیمپئن شپ مقابلہ میں وہ شریک نہ ہو سکے اور مفت میں گاما کو رستم زماں کا اعزاز مل گیا۔ پٹرسن نے بتایا کہ جب تک گاما اس سے مقابلہ کر کے شکست نہ دیں رستم زماں نہیں ہو سکتے۔ راجہ بھوپندر سنگھ نے کمال فیاضی سے پیٹالہ آنے اور گاما سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ اخراجات کے علاوہ بیس ہزار روپے دینے کا بھی وعدہ کیا۔ ۲۴ فروری ۱۹۲۹ء پیٹالہ میں پٹرسن اور گاما کا چیلنج مقابلہ ہوا۔ پٹرسن بہت طاقتور پہلوان تھا لیکن صرف تین منٹ میں اس کشتی کا فیصلہ ہو گیا اور پٹرسن ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر چٹ پڑ گیا۔

پٹرسن کے بعد دنیا کے کسی پہلوان | کئی بار گامانے ان سے مقابلہ کرنے دنیا کے پہلوانوں کو چیلنج کیا لیکن کسی نے ان سے گاما سے مقابلہ نہیں کیا | کشتی رونے کی جرأت نہیں کی۔ اس لیے گاما دنیا کی وہ عظیم شخصیت تھے جو کشتی کی دنیا سے ناقابل شکست چیمپئن کی حیثیت سے بڑی شان اور آں سے ریٹائرڈ ہوئے۔

آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں کے پہلی مرتبہ گاما پہلوان رستم زماں | دونوں شہزادوں والا شان نواب اعظم جا کی حیدر آباد میں آمد اور والا شان نواب معظم جاہ کا شادی ترکی شہزادیوں سے یورپ میں ہوئی۔ شادی کے بعد جب شہزادے اپنی دہلی کے ساتھ حیدر آباد لوٹے تو رعایا اور حکومت کی جانب سے ان کا شایان شان استقبال ہوا۔ اس مسرت میں موسیقی، گیمیں وغیرہ کے کئی پروگرام ہوئے اس موقع پر شاندار ونگل کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس دنگل میں شرکت

کے لیے ہندوستان کے کئی پہلوؤں کو حیدر آباد بلایا گیا تھا۔ چنانچہ گاما پہلوں
اسی سلسلہ میں پہلی مرتبہ یکم جنوری ۱۹۳۲ء حیدر آباد تشریف لائے۔ ان
قیام حیدر آباد میں مکہ مسجد کے سامنے ”بیگم کی مسجد“ کے بالکل قریب ایک مکان
میں رہا جو استاد عیسیٰ کی تعلیم سے بہت قریب تھا۔ استاد عیسیٰ حیدر آباد کے
ایک بڑے پہلو تھے۔ گاما کی تعلیم کے دو پہلوؤں قمر الدین پہلوں اور فتح دین
پہلوں سے مراسم دوستی قائم رہنے کی وجہ گاما پہلوں کا غائبانہ تعارف
استاد عیسیٰ سے تھا۔ استاد عیسیٰ کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے فرزند محمد بن عیسیٰ
پہلوں سے گاما پہلوں کا ربط قائم ہو چکا تھا چنانچہ گاما پہلوں نے کسی عائشہ
موسل میں ٹھہرنے کی بجائے ————— استاد عیسیٰ کی تعلیم کے قریب ہی مکان
میں اپنے ساتھ آئے ہوئے پچیس پہلوؤں کے ساتھ قیام کرنا پسند کیا حیدر آباد
میں گاما پہلوں سے کسی کے مقابلے کا سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ گاما پہلوں اور
ان کے بھائی امام بخش پہلوں نے یوسف بازار (نیاپل) کے دنگل میں دوڑ مائی
اور فن کا مظاہرہ کر کے یہاں کے شائقین کو لطف اندوز کیا۔ ایک ہفتہ گاما
پہلوں کا یہاں قیام رہا اس عرصہ میں گاما پہلوں نے استاد محمد بن عیسیٰ کو اپنی
شاگردی کا شرف بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسیٰ استاد کے اکھاڑے کو گاما
پہلوں کا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں۔

انگریزوں کے دور میں جنگی امداد کے سلسلہ
دوسری مرتبہ حیدر آباد میں! | میں ہندوستان میں ہر جگہ ”کارینوال“ ہوتے
تھے چنانچہ حیدر آباد میں ایک کارینوال ”کاروان“ کے نام سے بمقام بازی گاہ
بیت آباد (پیٹھ حسین ساگر) قائم ہوا تھا۔ تفریحات کے کئی پروگرام اس میں
اس زمانہ میں کشتی کا دنگل ہر ٹائٹس کا ایک لازمی جز تھا۔ اس سلسلہ میں
کان کیمٹی نے ایک بڑے دنگل کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ہندوستان اور یورپ
سے چار سو پہلوؤں نے اس دنگل میں حصہ لیا۔ استاد محمد بن عیسیٰ صاحب
پہلوں کی سفارش کی بناء پر گاما پہلوں دوسری مرتبہ اس دنگل میں حصہ لینے

۱۹۴۱ء جہد آباد تشریف لائے۔ مقنن نمائش کی خواہش کو نظر انداز کر کے گاما پہلوان نے دوسری مرتبہ بھی استاد عیسیٰ کی تعلیم کے قریب ٹھہرنا ہی ناپسند کیا۔ اب کے بھی ان کے ساتھ اور پہلوانوں کے علاوہ رستم ہندامام بخش چھوٹا گاما پہلوان، حمیدہ پہلوان، لواب پہلوان، بھولو پہلوان، اسلم پہلوان، اکرم پہلوان، آعظم پہلوان اور حسو پہلوان بھی تھے۔ استاد محمد بن عیسیٰ پہلوان نے اس مرتبہ ان تمام پہلوانوں کی مہمان نوازی کے فرائض بڑی سیرجشی اور فراخ دلی سے ادا کئے جو ایک یادگار بات ہے۔ ایک ماہ وہ یہاں رہے۔ گاما پہلوان سے ٹوکسی کا مقابلہ اس کا روانہ نگل میں نہیں ہوا البتہ ان کے ساتھ آئے ہوئے پہلوانوں کے مقابلے دوسرے پہلوانوں سے ہوئے تھے۔ گاما پہلوان نے اب کے بھی اپنے بھائی امام بخش سے نگل میں دآد پیچ کا مظاہرہ کر کے دلدادگان کشتی کو خوش کیا۔

گاما پہلوان کی شادی | گاما پہلوان نے اٹھائیس سال کی عمر میں گامو

پہلوان کی صاحبزادی لواب بیگم سے لاہور میں شادی کی شادی کے تین سال بعد لواب بیگم کا انتقال ہو گیا ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی ان ہی گامو پہلوان کی دوسری صاحبزادی وزیر بیگم سے قراپائی جن سے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ تمام لڑکوں کا انتقال ہو گیا لڑکیاں بقیہ حیات رہیں۔ گاما کی ایک لڑکی رشیدہ اختر کی شادی ان کے بھائی رستم ہندامام بخش پہلوان کے فرزند بھولو پہلوان سے ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان انگریزوں کا پاکستان منتقل ہونا | کے طوق غلامی سے آزاد ہو گیا۔ دو

قومی نظریہ کی بنیاد پر ملک کی تقسیم ہو گئی اور بھارت اور پاکستان دو علیحدہ مملکتیں وجود میں آئیں۔ تقسیم کے نتیجے میں دونوں طرف کی آبادی کو نقل مقام کا مرحلہ پیش آیا۔ فرقہ پرستوں نے فسادات کی آگ بھڑکادی۔ بھارت اور پاکستان میں ٹوٹ مار قتل و غارت گری کے سحر مناک اور بھیانک واقعات

گاما اور اُن کا خاندان بھی متاثر ہوا۔ جان و مال کا جب خطرہ لاحق ہوا تو وہ ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ وہ اور ان کا خاندان پٹیلہ سے لاہور پاکستان روانہ ہوا۔ ان کا قیام لاہور میں رہا۔

۱۹۵۵ء گاما پہلوان کو دل کا دورہ پڑا اور
گاما پہلوان کی بمبئی ساری | پھر ان کو دمہ بھی ہو گیا یہ صدر پاکستان

ایوب خاں کا زمانہ تھا۔ میمور ہسپتال میں ان کے علاج کا انتظام ہوا۔ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ تمغہ امتیاز کے ساتھ پانچ ہزار کا انعام دیا گیا۔ لیکن بتدریج ان کی صحت گرتی گئی۔ دل کے دورے بھی پڑے مسلسل سات مہینے لبتہ بربادی پر رہے۔ دنیا کا طاقت ور پہلوان اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ سلام کا جواب بھی ہاتھ اٹھا کر دینے کے قابل نہ رہا اور جسم پر بھیجی ہوئی کچھ بھی اڑا نے کی سکت نہ رہی۔ نا قدر دانی کے باعث معاشی حالت بھی خراب ہوتی گئی۔

۲۲ مئی ۱۹۶۰ء کی شام ان کو دل کا سخت دورہ پڑا
گاما پہلوان کا انتقال | اور دوسرے دن دوشنبہ ۲۳ مئی ۱۹۶۰ء اُن

کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ ان کا انتقال اپنے مکان موہنی روڈ لاہور میں ہوا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی ان کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین حضرت پیر مکی کے قبرستان میں مغرب کے فوراً بعد ہوئی۔

اگر ہم گاما پہلوان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کریں
گاما پہلوان کی سیرت | تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ طاقتور

داؤ پیچ کے فن ہی کے رستم زماں نہ تھے بلکہ اعلیٰ اخلاق اور بلند کرداری میں بھی تمام دنیا کے پہلوانوں کے مقابلہ میں اخلاق کے رستم زماں کا اعتراف ان کو حاصل ہے۔ سینہ تان کر سر اونچا کر کے چلنا ان کو آتا نہ تھا ہمیشہ ان کی نگاہیں نیچی رہیں اور گردن جھکی ہوئی۔ ادنیٰ آواز سے بات نہ کرتے بلکہ ہم اور ملائمت سے گفتگو کرتے کسی سے جھگڑا تو بڑی بات ہے کسی کو

غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ تک کرتے بھی نہیں دیکھا۔ غرور اور تکبران میں نام کو نہ تھا شکست خوردہ پہلوانوں کا ذکر عزت سے کرتے اور ان سے اخلاق سے ملتے۔ شراب ابھون نے کبھی نہیں پی۔ یا بند صوم و صلوات تھے اور متقی اور پرہیزگار بھی۔ زندگی بہت سادہ تھی ہمیشہ سادہ مقررہ لباس ہی پہنا۔ گالی گلوچ اور خشن کلامی سے کبھی ان کی زبان آلودہ نہیں ہوئی وہ ہمیشہ شائستگی اور اخلاق کا نمونہ بنے رہے۔ اس کے ساتھ زندہ دلی اور خوش مزاجی ان کی سرشت میں تھی اہل کمال کو اپنے کمال و فن پر ناز ہوتا ہے لیکن گاما پہلوان فن اور شہرت کی بلند بل پر پہنچ جانے کے باوجود اپنے کمال پر غرور نہیں کیا کسی نے پوچھا کہ آپ کی کامیابی کا کیا راز ہے تو جواب دیا اللہ کی ہر بانی کے سوا کچھ نہیں: ”کتاب رستم ناما گاما“ کشتی کا فن دیگر فنون کی طرح ایک قدیم ترین فن ہے۔ ہر ملک اور ہر جگہ پہلوانوں کی عزت اور

گاما پہلوان کی عظمت

قدر و منزلت تھی۔ اہل ملک اپنے شہنشاہ اور پہلوانوں پر فخر و ناز کرتے تھے تاریخ کی کتابوں اور شاعروں کے اشعار میں ان کے کارناموں کی داستان محفوظ ہے لیکن گاما پہلوان کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے گاما پہلوان جب پیدا ہوئے تو ہندوستان انگریزوں کے زیر اقتدار بدترین غلامی کے دور سے گزر رہا تھا اپنی ذاتی دل چسپی اور محنت سے وہ فن کشتی کے باہر عروج پر پہنچے اور پھر آقاؤں کے شہر لندن میں یورپ کے دیو ہیکل اور شہنشاہ نور پہلوانوں کو مسٹوں میں شکست دے کر ”رستم ناما“ کا اعزاز اپنے آقاؤں ہی سے حاصل کیا۔ اپنے فن میں یگانہ روز ہونے کے ساتھ ان کی شخصیت اور سیرت میں ایسی خوبیاں تھیں کہ آج بھی ان کے لیے عزت اور فخر کا جذبہ موجود ہے ہندو پاک کے بلند مرتبہ عالم دین حضرت ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ عالی جب پہلی مرتبہ لاہور گئے تو اپنے سفر نامہ میں لکھا:-

”علمی دادی محفلوں میں شریک ہوا۔ رستم ناما گاما پہلوان اور بعض ہندوستان گیر اور بعض عالمگیر شہرت رکھنے والے اہل کمال کی زیارت کی“

پرانے چراغ جلد اول

ہندوستانی طرز کی کشتی لڑنے کا دور ختم ہو گیا اب اگر کہیں ہے بھی تو اس کا حال بچتے چراغ کی طرح ہے۔ لیکن ہر دور کا مورخ گامایہ لوان رستم زماں اور ان کے فن پر تخیس آفرین کے پھول سچھا کرے گا۔

تاری استاد محمد بن عیسیٰ پہلوان

باقیات الصالحات اور دکن کی یادگار بزرگ شخصیت جناب استاد محمد بن عیسیٰ صاحب پہلوان اس دنیا سے رخت ہو گئے۔ ان کے انتقال سے حیدرآباد دکن میں فن پہلوانی کا تاریخی اور معلومات افزا باب ختم ہو گیا۔

استاد محمد بن عیسیٰ کا تعلق ملک عرب کے اس قبیلہ سے ہے جو اپنے وطن حضرموت سے بعد اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیجاں وارد حیدرآباد ہوا۔ ان کے جد بزرگوار عقیف بن علی الیافعی صاحب اپنے تین فرزندوں صالح بن عقیف، عیسیٰ بن عقیف اور عید اللہ بن عقیف کے ساتھ حیدرآباد کو اپنا مسکن بنایا اور محکمہ نظم جمعیت سرکار عالی حکومت حیدرآباد میں ملازمت اختیار کی۔ ان کے دوسرے فرزند عیسیٰ بن عقیف کی عمر اس وقت صرف سات سال تھی۔ پہلے وہ مدرسہ نظامیہ میں زیر تعلیم رہے بعد ازاں وہ بھی اسی محکمہ نظم جمعیت میں ملازم ہو گئے۔ ان کی شادی ایک شریف و معزز عورت گھرانے میں جناب صلاح بن یحییٰ الیافعی صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی جو حیدرآباد کے مشہور محقق جناب عمر الیافعی صاحب کی خواہر تھیں جن کے بطن سے تین فرزند محمد بن عیسیٰ، علی بن عیسیٰ اور عقیف بن عیسیٰ اور ایک صاحبزادی تولد ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حیدرآباد میں امراء کی قدر دانیوں اور سرپرستی کی بدولت فن کشتی کا بڑا شہرہ تھا۔ کشتی کو ایک شریفانہ فن سمجھا جاتا تھا۔ خواص و عوام اس فن کے بڑے شائق اور دل دادہ تھے یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں اس

فن کے استاد، ان کی تعلیم اور اکھاڑے موجود اور مشہور تھے۔ شمالی ہند سے کئی نامی گرامی پہلوان یہاں کے دنگل میں حصہ لینے اور قدر دان کی امید لے کر آتے تھے۔ استاد عیسیٰ کو کشتی اور زور آزمائی کا فطری شوق تھا اپنے اسی جذبہ شوق کی بناء پر وہ استاد فخر الدین دہلوی کے شاگرد ہوئے جن کا قیام ان دنوں حیدر آباد میں تھا۔ بہت جلد اپنی ذاتی دل چسپی سے کشتی کے داؤ پیچ سیکھے اور دور و نزدیک کا سیلاب کشیاں لڑ کر نام آور ہوئے اور پھر فن کشتی کے استاد کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوئی۔ امیر پانیکہ لڑا بلی الدولہ اور لڑا بلی صاحب کلیانی قدر دان تھے اور سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی ”تعلیم“ اور اکھاڑے کا شمار حیدر آباد کے مشہور اکھاڑوں میں ہوتا ہے چنانچہ تاریخ ”ملکت اصفیہ“ جلد اول ص ۲۲۸ مطبوعہ پاکستان میں درج ہے: ”یوں تو بلدہ حیدر آباد اور اضلاع میں ہزاروں اکھاڑے تھے مگر بلدہ کے دو اکھاڑے سب سے زیادہ مشہور تھے عیسیٰ پہلوان کا اکھاڑا اور ملکر کی تعلیم“ استاد عیسیٰ ایک ماہر فن پہلوان ہونے کے ساتھ قدر دان فن بھی تھے اور خاص بات یہ کہ عربوں کی مہمان نوازی کا امتیازی وصف بھی ان میں تھا چنانچہ شمالی ہند سے آنے والے پہلوانوں کی ان کے ہاں زیادہ ریل پل رہتی تھی۔ شمالی ہند (پنجاب) کے دو پہلوان قمر الدین پہلوان اور فتح دین پہلوان جن کا تعلق گاما اکھاڑے سے تھا جب بھی حیدر آباد آتے ان کا قیام طعام استاد عیسیٰ کے ہاں رہتا۔ ان پہلوانوں کی وجہ رستم زماں گاما اور رستم ہند امام بخش سے استاد عیسیٰ کا غائبانہ تعارف ہوا۔ جب استاد عیسیٰ کا ۱۳۴۴ھ انتقال ہوا تو رستم زماں گاما کی نظر عنایت ان کے فرزند محمد بن عیسیٰ پر پڑی۔ قمر الدین پہلوان ہی نے حیدر آباد میں استاد پہلوانوں کی موجودگی میں محمد بن عیسیٰ کی دستار بندی کی اور ان کو اپنے والد استاد عیسیٰ کا جانشین بنایا۔

بتقریب شادی شہزادگان والا شان آغظم جاہ ولی عہد دولت اصفیہ معظم جاہ حیدر آباد میں ایک شاندار جشن منایا گیا تھا۔ مختلف اسپورٹس سمویٹی

کے پردگرام، نمائش اور مشاعرے سب ہی ہوتے۔ اس جشن کو یادگار بنانے کے لیے ارکان کمیٹی نے پہلوانوں کے ایک عظیم الشان دنگل کا اہتمام کیا، حیدر آباد اور ہندوستان کے بڑے پہلوانوں کے اس دنگل میں شریک ہونے کا انتظام ہوا۔ ارکان کمیٹی کی درخواست پر استاد محمد بن عیسیٰ نے گاما پہلوان، امام بخش پہلوان اور حمیدہ پہلوان کو اس تاریخی دنگل میں شرکت کی سفارش کی چنانچہ جنوری ۱۹۳۲ء یہ نامور پہلوان پہلی مرتبہ حیدر آباد آئے۔ گاما پہلوان نے کسی ہوٹل یا کسی جگہ ٹھہرنے کی بجائے استاد کے گھر اور عیسیٰ تعلیم کے قریب ہی ٹھہرنے کو ترجیح دی یہاں ان کا قیام صرف ایک ہفتہ رہا اس مختصر مدت میں حاصل بات یہ رہی کہ گاما پہلوان نے استاد محمد بن عیسیٰ کو اپنی شاگردی کا شرف بخشا۔

جنگی امداد (دارفند) کے سلسلہ میں انگریز راج میں جگہ جگہ بڑے شہروں میں کارنیوال ہوتے حیدر آباد میں بھی کارنیوال اور نمائش کا انتظام ہوا۔ اس کارنیوال میں کئی تفریحی پردگرام شامل تھے اس زمانے میں بغیر کشتی مقابلہ کوئی بڑی تقریب یا نمائش نامکمل سمجھی جاتی تھی۔ اسی اہمیت کے پیش نظر منتظین کارنیوال نے اس کارنیوال میں پہلوانوں کے دنگل کا بھی اہتمام کیا۔ یہ یادگار دنگل کارون دنگل کے نام سے مشہور ہے اس دنگل میں حصہ لینے ہند اور بیرون ہند زبوروں سے کئی نامور پہلوان آئے تھے۔ جن کی تعداد چار سو تھی۔ اس دنگل کو یادگار بنانے کے لیے منتظین نے رستم دانا گاما پہلوان اور ان کے بھائی رستم ہند امام بخش پہلوان کی شرکت کو بہت ضروری سمجھا چنانچہ گاما پہلوان اور امام بخش پہلوان دوسری مرتبہ لاہور سے حیدر آباد تشریف لائے۔ منتظین نے ان کے اور ان کے ساتھ آئے ہوئے پچیس پہلوانوں کے قیام و طعام کا انتظام ہوٹل میں کیا تھا لیکن گاما پہلوان کی اعلیٰ طرزی تھی کہ اپنے آرام اور سہولتوں کو نظر انداز کر کے انھوں نے دوسری مرتبہ بھی ازراہ قدر افزائی استاد کے مکان اور تعلیم کے قریب ایک مکان میں اپنے ساتھ آئے ہوئے پہلوانوں سمیت قیام کرنا مناسب جانا یہاں ان کا قیام ایک ماہ رہا۔ استاد محمد بن عیسیٰ کی شخصیت کا بڑا اثنا بنا کہ پہلو یہ بھی ہے کہ عربوں

کی ہمان لٹری کے وصف ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاما پہلوان اور ان کے ساتھی دیگر پہلوانوں کی دود فہ جس سیرجشی اور خوارخ دلی سے ہمان لٹری کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ گاما پہلوان پر کئی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں مگر گاما پہلوان کے دود فہ حیدر آباد آنے اور ان کے قیام کا کسی نے بھی کچھ ذکر نہیں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جس تعلیم کی مٹی پر رستم زماں گاما، امام بخش، حمید پہلوان، چھوٹا گاما، بھولو پہلوان اور برادران بھولو کا پستہ ٹپکا ہو یقیناً وہ ایک یادگار اور قابل احترام تعلیم اور ورزش گاہ ہے۔ استاد محمد بن عینی نے فن کشتی کو زندہ اور برقرار رکھنے اور لڑجواؤں میں کشتی کے شوق کے اچھارنے میں بڑے قابل قدر خدمات انجام دیئے ہیں جو تاریخ دکن میں زرین حروف میں لکھے جا میں گے ہندوستان اور حیدر آباد کے مشہور پہلوانوں کے حالات زندگی، ان کی فن پہلوانی میں مہارت، ان کی کشتیوں میں ہارجیت کے راز ہائے سرستہ جیٹم دیدکشتی کے مقابلہ اور دائرہ بیچ کی نزاکتوں سے وہ اس درجہ واقف تھے گویا اس فن کی جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔ لاتعداد شاگرد تھے لیکن جن شاگردوں نے استاد کے نام کو روشن کیا ان میں حاجی پہلوان، سالم پہلوان، علی لڑزی پہلوان، افسر پہلوان، شیخ صالح پہلوان، صدیقی پہلوان، قرابین خان عرف چاند پہلوان، مقبول پہلوان اور محمد پہلوان بہت مشہور ہوئے۔ کشتی ایک ایسا فن ہے جس میں فرقہ پرستی کو دخل نہیں اور نہ ہندو مسلمان کا بھید بھاؤ ہے۔ استاد چاہے کسی فرقہ کا ہو اس کی بڑی عزت و تعظیم کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ استاد کی حیدر آباد اور حیدر آباد کے باہر بڑی توقیر و عزت تھی خوبی قسمت سے مجھے استاد محمد بن عینی کی صحبت میں بیٹھنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ گزرے ہوئے پہلوانوں کا ذکر چاہے وہ کسی فرقہ کے ہوں ان کا عزت سے نام لیتے اور ان کے فن کی تعریف کرتے تھے۔ کولہا پور سے جب بھی ہندو پہلوان حیدر آباد آتے تو وہ ضرور استاد سے ملتے تھے اور استاد ان سے بڑی

محبت سے ملتے اور ان کی خاطر مدارت کرتے۔ حیدر آباد کے اکھاڑوں اور یہاں کے استادوں میں استاد کی ایک منفرد و مسئلہ شخصیت تھی ان کی رائے کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

استاد محمد بن عیسیٰ کو پہلوانی کا شوق ورثہ میں ملا تھا اور وہ اس فن کے استاد مانے گئے اسی کے ساتھ قرآن خوانی سے ان کا شغف اور قرأت و تجوید سے ان کا ذوقِ فضلِ ربّانی تھا انھوں نے باقاعدہ تجوید کی تعلیم حاصل کی تھی پہلے حضرت قاری سلیم معتیب کے شاگرد ہوئے اس کے بعد تاج القرآن حضرت قاری محمد تاج الدین صاحبؒ کے آگے زانوئے ادب نہ کر کے قرأتِ سیدنا عاصم کوئی، قرأتِ سبعہ، قرأتِ عشرہ مکمل کی اور صاحبِ سند ہوئے۔ ان کا محبوب مشغلہ علمِ تجوید و قرأت کی تعلیم تھا۔ بیگم کی مسجد واقع رو برد مکہ مسجد درسِ قرآن کا مدرسہ قائم کیا تھا بعد نمازِ فجر بلا معاوضہ بچے اور بچیوں کو قرآن پڑھانے کا سلسلہ برسوں جاری رکھا اور آخر آخر میں بوجہ ضعیفی اپنے گھر پر قرآن پڑھانے میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اللہ کے کرم سے یہ سعادت ان کو ملی جو قیامت تک ایک ثوابِ جاریہ اور ان کی بخشش اور مغفرت کی ضامن ہے۔

انے استاد حضرت قاری محمد تاج الدین صاحبؒ سے بڑی والہانہ عقیدت رکھتے تھے حضرت کا انتقال ہوا تو بہت متاثر تھے۔ تدفین کے وقت زمین پر وہیں بیٹھ گئے ان کے عقیدت مند اور میرے دوست فیاض الدین صابری بھی ساتھ تھے۔ جب میت لحد میں اتاری جارہی تھی تو مجھ سے کہا: ”اجی حفت وہ صفی صاحب کا کیا شعر ہے۔ صفی استاد کا اور باپ کا رتبہ برابر ہے“ ابھی دوسرا مصرعہ میری زبان پر آیا ہی تھا کہ دیکھا بے ساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں اس جذبہٴ عقیدتِ مندی اور محبت کو دیکھ کر بہت متاثر اور حیرت میں پڑ گیا کیوں کہ وہ شخص جس کی آنکھ سے اپنے دو جوان بیٹوں کے یکے بعد دیگرے انتقال کر جانے پر ایک قطرہ بھی آنسو

سکا نہ ٹپکا ہو اور جو تسلیم و رضا کی مثالی تصویر بنا رہا وہ اتنی برس کا بوڑھا اپنے عمر رسیدہ استاد کی موت پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے! یہی سعادت مندی کا جذبہ تھا کہ ہر رمضان میں اپنے والد کی سالانہ فاتحہ اور اسی طرح کاما پہلوان کے ایصالِ ثواب کا اہتمام ہر سال باقاعدگی سے کرتے تھے۔

استاد مرحوم بڑی خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت ان کا دلیہ تھا۔ ہمیشہ دوستوں سے خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے اور ہر قسم کی مدد کے لیے آمادہ رہتے۔ صاف گو تھے اور ریاکاری شعار نہ تھا۔ کشادہ دل اور کھلے ہاتھ کے تھے۔ یہ خاص بات تھی کہ اللہ نے نازک حالات میں ان کی بند مٹھی کا بھرم رکھا۔ خود دار ایسے کمنگی حالات میں اپنی محبوبوں کا کسی سے کوئی ذکر نہ کرتے۔ کہہ غم ان پر ٹوٹ پڑے مگر وہ تسلیم و رضا کی چٹان بنے رہے اور ہر دقت زبان پر اللہ کی نعمتوں اور احسانوں کا شکر رہتا تھا۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ دنیا نے ان کو ہمیشہ ایک رنگ اور ایک حال میں دیکھا میں نے ان کو ہمیشہ خوش حال اور زندہ دل پایا۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر آدمی غم بھول جاتا تھا۔ انھوں نے پہلوانی کے شریفانہ فن کی تادمِ اخراج بھی غنڈہ گردی، داداگیری اور جائیز ناہائز کا رویار سے سخت نفرت تھی۔ اپنے فائدہ کے لیے شاگردوں کو کبھی آلہ کار نہیں بنایا۔ ان کے شاگرد بھی اپنے استاد کے جذبات اور طریقہ کار کا احترام کیا اور اکھاڑے کی نیک نامی پر حرف آنے نہیں دیا استاد کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ دولت کی ہوس ان کو نہیں تھی بلکہ اللہ کی رضا جوئی اور اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے کا جذبہ تھا۔ بیگم کی مسجد کے لیے دو قیمتی بلوری جھاڑ اور آٹھ قیمتی کنول لگاے اور کئی قلمی غیر مطبوعہ کتب مع خوب صورت الماری کا تحفہ اس مسجد میں پیش کیا۔ یگانہ سے بہت دل چسپی تھی اور اس فن میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ کھارا ہوا بیٹھا

دل اپنے ہاتھ سے اس خوبی سے پکاتے کہ کیا کوئی پکا سکے گا۔ ان کو دیکھ کر رولز کی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ ہم نے امیروں اور دولت مندوں سے ہاں بھی کھایا ہے لیکن استاد کے تیار کردہ غذاؤں اور ان کے خلوص سے آگے سب کے دسترخوان پھیکے نظر آئے۔

استاد کے صرف دو صاحبزادے تھے لیکن افسوس ان دونوں کا جوانی بے حدہ میں انتقال ہو گیا۔ استاد اپنے پوتروں کی خواہش پر بتاریخ ۲۲ اپریل ۱۹۰۷ء عمر کے لیے جدہ روانہ ہوئے تھے وہیں رہ جانے کا ارادہ تھا لیکن ہاں رہنے کا موقع نہ مل سکا اس لیے چند ماہ رہ کر حیدرآباد واپس ہو گئے۔ بعدہ جاتے وقت اپنا قدیم ذاتی مکان فروخت کر دیا تھا اس لیے اپنی "خلیم" ہی میں ٹھہر گئے اس موقع پر ان کے دل پر کیا گزری اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ایسے خوش رہے کہ اپنی دلی کیفیات کا احساس کسی کو ہونے نہیں پایا۔ اللہ جب کسی پر کرم کرنا چاہتا ہے تو اپنے کسی بندہ کو اس کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ ان کے عزیز شاگرد مقبول پہلوان (بارکس) نے تعلیم کے سامنے ایک مختصر سی مدت میں آرمی می کاموزوں اور آرام دہ مکان اپنے ذاتی ضرورتوں سے صرف اخلاص اور جذبہ سعادت مندی سے استاد کے لیے تعمیر کیا اور آخر وقت تک مقبول پہلوان نے جس طور سے حتی شاگردی و خدمت گزار کی کے فرائض انجام دیتے اس کی مثال مشکل سے ملے گی اس مکان میں استاد چند آخری ہینے زندگی کے نہایت اطمینان و سکون کے بسر کئے۔ اچھے خاصے تھے ایک دن طبیعت خراب ہوئی اور بے ہوش ہو گئے۔ اس بے ہوشی کا چار دن دوا خانہ در شہوار میں شریک رہ کر رات گیا رہنے بتاریخ ۲۲ مئی ۱۹۰۷ء ہجرہ ۱۲ سال انتقال کر گئے۔ دوسرے دن نماز جنازہ مکہ مسجد میں ادا ہوئی اور ان کی وصیت کے مطابق تدفین درگاہ حضرت شجاع الدین صاحب عیدی بازار میں عربی کے ادیب و شاعر پدماشری حضرت عابدی عبداللہ المذبح علوی صاحب کے پہلو میں ہوئی۔

استاد اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی یادوں کے چراغ ان لوگوں کے
دلوں میں روشن رہیں گے جن کو ان سے ربط اور تعلق خاطر تھا۔ !

قطعہ تاریخ و قاسم زمان گاما پہلوان

قاسم زمان گاما پہلوان کی وفات کی خبر سن کر دکن کے نامور
تاریخ گو شاعر جناب حکیم خواجہ شفیع حسن البعللانی صاحب مد
نے جو پڑ اثر تاریخ بھی تھی وہ حسب ذیل ہے :

تمام عمر کسی پہلوان سے چت نہ ہوئے
بلی تھی حق سے وہ طاقت اغیہ خدا کی پناہ
خبر وفات کی سن کر کہا یہ عارف نے
پچھاڑا موت نے تو قاسم زمان کو واہ

مولوی عبدالحق کی اُردو لغت اور ریاست حیدرآباد

سال سنہ ۱۹۹۰ء کا یادگار سٹف جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب ریسرچ آفیسر آندھرا پردیش آرکائیوز کی اپنی نوعیت کی منفرد تاریخی و تحقیقی پیش بہا تصنیف ”بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد“ کے عنوان سے زیور طبع سے مزین ہوئی تھی۔ اس معرکتہ الآراء تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے چند بیرونی علماء اور مشاہیر ادب کو ان کے علمی و تحقیقی پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع نے جو فیاضانہ مالی امداد دی نیز ان کی ذات کے لیے تاحیات جو گرانقدر، وظائف عطا فرمائے، کی تفصیلی روداد آرکائیوز کے ذخیرہ میں محفوظ رکھا رکھنے کی مدد سے اپنے استاذ و رفیق کے ساتھ بڑے ترتیب اور سلیقہ سے پیش کیا۔

پڑھ کر جہاں حضور نظام خسرو دکن آصف سابع کی شاہانہ علم پروری و فیاضانہ داد و دہش سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے وہاں یہ محب خیر تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضور نظام کی بے دریغ و بے مثال مالی امداد سے متمتع ہونے والے ذی مرتبت علماء و مشاہیر نے نہایت سرسری انداز میں اس کا ذکر کیا اور بڑا تعجب یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ ان کے مداح و قائل سوانح نگاروں نے ان عطایائے سلطانی اور ریاست حیدرآباد کی عظیم النظیر نذر دانی علم و فن کا تذکرہ کرنا بھی گناہ کبیرہ سمجھا۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ ابھی حال میں ۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء کو دلی میں ہائے اُردو لڑی عبدالحق کی ادبی و لسانی خدمات پر ایک عظیم الشان چار روزہ بین الاقوامی

سمینار ہوا اور اقطاع ہندو پاک کے علاوہ دوسرے ملکوں سے اہل علم و دانش اس سمینار میں شریک ہو کر بابائے اردو اور ان کے خدمات جلیلہ کو خراج تحسین پیش کیا، جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب نے مولوی عبدالحق کے تعلق سے ایک چولنکا دینے والا انکشاف اپنے مضمون بعنوان ”مولوی عبدالحق کی اردو لغت اور ریاست حیدرآباد“ دکن کے موثر روزنامہ سیاست کی اشاعت مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۱ء میں کیا۔ اس مضمون میں یہ راولوں کی متضاد بیانی ہے نہ دماغی اختراع کی جدت اور نہ کوئی خود ساختہ انسا طرازی بلکہ اس کا ماخذ آرکائیو کی وہ فائیل ہے جس میں مولوی عبدالحق کی درخواست اردو لغت کی تیاری کی تکمیل کے لیے ریاست حیدرآباد کی گران قدر مالی امداد اور حضور نظام کی شاہانہ سرپرستی کی مصدقہ روداد درج ہے۔ فائیل کی روداد سے یہ واضح ہے کہ مولوی عبدالحق کی درخواست پر حکومت حیدرآباد نے لغت کی تیاری و تدوین کے لیے ماہانہ ایک ہزار روپیہ دس سال کی مدت تک منظور کیا۔ مزید برآں مولوی صاحب کے حسب استدعا ڈھائی سو مشاہرہ پر ایک سال کی مدت کے واسطے کی منظوری دی۔ لغت کی طباعت کے لیے ایک قیمتی مالوماتیپ مشین خرید گیا۔ مولوی صاحب کی سفارشات حکومت نے اس شرط پر منظور کیں کہ لغت حکومت کی ملکیت ہوگی اور اس کے جملہ حقوق بحق جامعہ عثمانیہ محفوظ رہیں گے برسوں اس لغت کی تیاری کا کام چلتا رہا لیکن معلوم نہیں کیوں حکومت کی بار بار توجہ دہانی پر مولوی صاحب نے مرحلہ بہ مرحلہ تکمیل ہونے والے کام کو سرکار میں داخل نہیں کیا اور پھر یہ بھی ایک معصیہ ہے کہ باوجود بار بار مسودہ طلب کرنے پر اسے حکومت کے والے کرنے کی بجائے نہ صرف اپنے پاس رکھا بلکہ بغیر اجازت اپنے ساتھ دلی لے گئے۔ یہ طریقہ کار مولوی صاحب اور حکومت کے مابین شرائط کے منافی تھا۔ اس راز سرجمتہ کا انکشاف اس وقت ہوا جب مولوی صاحب پاکستان منتقل ہو گئے اور انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ ۵۲-۱۹۵۵ء

مشاعرہ عرس حضرت فیض کی غزلیات کا پہلا مجموعہ

دکن کی سرزمین نے جن مقدس اور باکمل ہستیوں کو جنم دیا۔ ان میں حضرت فیض کی ذات گرامی اپنا ایک خاص امتیازی مقام رکھتی ہے۔ نام آپ کا میرس الدین محمد اور متخلص فیض تھا۔ آصف جاہ ثانی غفرلہ لآب میر نظام علیاں کے عہد میں بمقام برار ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت برار قلم و آصفیہ میں شامل تھا۔ اس لیے فرماتے ہیں:

شعراے ہند کے سب فیض جہیں کہتے ہیں

حیدر آباد دکن خاص وطن ہے ان کا

تین سال کی عمر تھی جب آپ برار سے اپنے والد میر امیر الدین صاحب کے ساتھ شہر حیدر آباد آئے اور یہیں تعلیم و تربیت کے مرحلے طے ہوئے۔ جب لواب میر نظام علی خاں کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔ مغفرت منزل لواب سکندر جاہ غفرال منزل لواب ناصر الدولہ اور مغفرت مکان لواب افضل الدولہ کے دور حکومت میں حضرت فیض بقید حیات تھے۔ اور چھٹے بادشاہ غفرال مکان لواب میر محبوب علی خان کی پیدائش (۱۲۰۸ھ) کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تمام تذکرہ نگاروں نے بہت تعریف اور احترام سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ اور آپ کو کثیر التصانیف بتایا ہے۔ لیکن آپ کی چند کتابیں مطبوعہ میں اور باقی غیر مطبوعہ۔ اردو کلام کے علاوہ دیوان ”مکملہ عرفان“ اور ”دیوان فیض“ (جس میں فارسی کلام بھی ہے) مطبوعہ موجود ہیں۔ بحیثیت شاعر جملہ اصناف سخن میں یدِ طولی رکھتے تھے۔

دکن کے بادشاہوں کی شاہانہ سرکشتیوں اور امر کی تندرانیوں کے سبب کئی بیرونی شعراء شاہ نصیر دہلوی شیخ حفیظ دہلوی اور مشتاق میرٹھی وغیرہ دکن آچکے تھے اور متوسلین میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ مقامی شعراء ایمان قیس، بجلی اور آگاہ و حیدر جیسے استادانِ سخن کی سخن طرازی سے شعرو سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ ان محفلوں میں جواں سال فیض نے بہت جلد اپنی سخن سنجیوں کی بدولت محفل شعرا میں جگہ بنالی اور کالمین فن سے خراج تحسین پایا۔ بلند مرتبہ شاعر ہونے کے علاوہ حضرت فیض علوم ظاہری و باطنی میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ آپ ایک صوفی کابل اہل اللہ تھے۔ مشرب صلح کل رکھتے تھے۔ آپ کا کمال فن یہی ہے کہ اپنے مشاہدات اور واردات قلبی شاعرانہ خوبصورتی کے ساتھ کچھ اس طرح اشار میں سموئے ہیں کہ شراب معرفت دو آتشہ ہو گئی۔

بے شمار مرید اور لالہ داد شاگرد و معتقدین بلا لحاظ مذہب ہندو مسلمان آپ سے وابستہ تھے جن میں امیر بھی تھے اور فقیر بھی جو آپ کو نہ صرف استاد بلکہ روحانی پیشوا اور پیرِ طریقت جانتے تھے۔ نظم ہو یا نثر جہاں کہیں بھی اپنے استاد حضرت فیض کا ذکر کیا ہے کچھ ایسی والہانہ عقیدت مندی سے کیا ہے کہ اس کی مثال دُنیا سے شاعری میں نہیں ملتی۔

حضرت فیض کا انتقال ۱۲ رجب سنہ ۱۲۸۳ھ حیدرآباد میں ہوا۔ آپ کا مزار آج بھی بیرون لال دروازہ مرجع خلافت ہے ۱۲ رجب سنہ ۱۲۸۴ھ آپ کا پہلا عرس ہوا اور مزار حضرت فیض پر مشاعرہ کا اہتمام بھی حضرت فیض کے عقیدت مند شاگرد محمد فیاض الدین خاں فیاض (المخاطب لوزن مشرق جنگ) نے پہلا عرس اور مشاعرہ کر کے اپنے استاد کو نذرِ عقیدت پیش کی اور پھر اس کے بعد ہر سال ہنایت اعلیٰ پیمانہ پر عرس اور مشاعرہ کا انتظام پابندی اور مستعدی سے کرتے رہے۔ مشاعرہ کی غزلیات ”گلہ ستہ فیض“ کے عنوان سے بڑے آب و تاب سے طبع ہوتے تھے اور جناب فیاض یہ گلہ ستہ عرس کے موقع پر بعد تناول طعام (برائے خاص و عام) شعرا کی نذر کرتے تھے۔ چنانچہ

قورمہ روٹی ملی اور ملا گلدستہ

ہم نے فیاضی کا احسان یہ احسان دیکھا

جناب فیاض وضع داری سے پینتالیس سال تک عرس و مشاعرہ کا اہتمام کر کے اپنے استاد حضرت فیض کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جب ان کا انتقال سنہ ۱۳۲۸ھ ہو گیا تو ان کے فرزند لاداب عزیز یار جنگ عزیز نے اپنے والد مرحوم کی یادگار اور ان کے نام کو قائم رکھنے کے لیے اس نامی گرامی مشاعرہ کو مزید پانچ سال تک جاری رکھا اور گلدستہ فیض بھی شل سالتی نہایت عمدہ طور سے چھپ کر نظر افروز خلافت ہوتا رہا۔ جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی تالیف ”فیض سخن“ میں حضرت فیض کے اعراض اور مشاعرہ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے ”قریب قریب پچاس سال تک یہ عرس اور اس کے مشاعرے حیدر آباد کی علمی و ادبی دنیا کا مرکز بنے رہے“ (۳۸)

مشاعرہ عرس حضرت فیض کی غزلیات کا پہلا مجموعہ اس وقت ہمایے پیش نظر ہے۔ سفید کاغذ کا سرورق چوڑے سے پھولوں کی بیل کے حاشیے سے مزین ہے۔ اوپر پہلی سطر جلی حروف میں خدا کی حمد و ثنا ہے۔

”ثنائے خدا سے سخن آفرین و سیاس خالق مہمان رنگین“

اس توصیف کے بعد درمیان میں ایک رباع میں عنوان کتاب ہے ”غزلہائے مشاعرہ عرس حضرت فیض“ رباع کے اطراف آٹھ اشعار کا قطعہ تاریخ وفات حضرت فیض ہے۔ جو آپ کے شاگرد حکیم محمد مظفر الدین خاں مزاج کا فرمودہ ہے۔ مادہ تاریخ یہ ہے۔

از سر آہی بگفتا رحلت شعر دکن

۱۲۸۳ھ

تاریخ وفات کے بعد دو لکیروں کے نیچے ایک سطر میں مرتب کنندگان مجموعہ کے نام نظر آتے ہیں۔

”حسب فرمائش ناظم شریعت بیان محمد فیاض الدین خان صاحب تخلص
فیاض و جناب میر احمد علی صاحب تخلص عمر“

پھر دو لکیر دل کے نیچے سرورق کی آخری سطر یہ ہے :-
”در مطبع کارنامہ لکھنؤ باہتمام محمد یعقوب مزین بہ طبع شد“

سرورق دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس پہلے شاعرے کا
انفقاد اور غزلیت مشاعرہ کی کتابی شکل میں ترتیب و صورت گری شاگردان
فیض جناب فیاض اور جناب عصر کی کوشش اور دل چسپی کا رہن منت ہے
یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مجموعہ غزلیات حیدرآباد میں نہیں بلکہ لکھنؤ کے
”مطبع کارنامہ لکھنؤ“ میں زیر طبع سے آراستہ ہوا۔

سرورق کی پشت پر حاشیہ ہے اور پیشانی کا غذبہ ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“
کے حروف جلوہ گر ہیں۔ بعد ازاں لاسطروں میں فارسی تحریر ہے اور اس تحریر
کے پورے پانچ سطر دل میں حضرت فیض کے نام سے پہلے صوفی تعریفی القاب
لکھے ہیں۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۲۸۲ رجب المرجب ۱۲۸۲ھ روز دوشنبہ تقریباً
عس محفل مشاعرہ طرخی علامہ دوران سلطان الشاعرین جناب حافظ شمس الدین
محمد فیض قدس سرہ الغریز کے مزار پر الازار پر منعقد ہوا تھا اور مجموعہ سخنوار
اعجاز بیان کے نتائج افکار کا آئینہ دار ہے۔ مزید یہ مراحٹ کی گئی ہے کہ
ہر قدر پرچہ ہا کہ دست یاب گشتند درج این اوراق پریشان شدند“
اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت فیض کے انتقال (۱۲۸۳ھ) کے بعد
دوسرے سال ۱۲۸۲ رجب المرجب ۱۲۸۲ھ عس اور مشاعرہ طرخی حضرت کے مزار
واقع لال دروازہ منعقد ہوا۔ مجموعہ غزلیات اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے
اور اس میں ۲۸ شعرا کا کلام درج ہے۔ جن میں زیادہ تر شاگردان فیض ہیں لیکن
”ہر قدر پرچہ ہا دست یاب گشتند“ سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس مشاعرہ
میں دیگر شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا تھا اور جن کی غزلیں دستیاب نہ
ہونے سے محروم اشاعت ہو گئیں۔

اس کتاب میں شعرا کی اردو اور فارسی غزلیں موجود ہیں لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس مشاعرہ کا طرح مصرع کیا تھا۔ مندرجہ غزلیں دیکھنے سے قیاس ہوتا ہے کہ طبع آزمائی کے لیے تین طرحیں دی گئیں تھیں۔ قافیہ ردیف اس طرح ہیں :

۱: فیضانِ فیض — دیوانِ فیض

۲: بیانِ جنابِ نص — شانِ جنابِ فیض

۳: در فیض صاحب کا — جوہر فیض صاحب کا

نمبر ایک اور دو طرحوں میں اردو اور فارسی شعراء نے سخن طرازی کی ہے اور نمبر تین میں صرف اردو میں غزلیں ملتی ہیں۔

ہر شاعر کا نام تخلص دو لکیروں کے درمیان درج ہے۔ اور جو غزلیں مندرج ہیں وہ شاعر کے تخلص کے سر حرف سے ردیف دار نہیں ہیں جیسا کہ گلدستوں کی اشاعت کا قاعدہ ہے۔ سب سے پہلے احتراماً حضرت فیض کے چھوٹے فرزند میر حیات الدین صاف [عرف اچھے میاں] کی غزل سے آغاز ہوا ہے۔ اس غزل کی بحر سادی غزلوں سے الگ ہے۔ اس مجموعہ غزلیات کی آخری غزل استاد سخن محمد حفیظ الدین پاس کی ہے۔

ایک خصوصی جدت طرازی اس مجموعے کی یہ ہے کہ ہر شاعر کے نام سے پہلے شاندار خطاب لکھے گئے ہیں جیسے ریختہ خامہ، شاعرِ یاد و بیاں، شاعرِ گوہ و قار، سخنورِ بلند فکر، آبروئے فکر و دریا کے نظم و نثر وغیرہ وغیرہ۔ حضرت فیض جیسے صوفی رازدار رموز خفی و جلی و پیر طریقت اور عظیم النظیر

ادیب و شاعرِ باکمال کے انتقال کے ایک سال بعد ہی عرس اور مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ تمام شاگردانِ فیض، سرید اور عقیدت مند اس وقت بقید حیات تھے جو اس چشمہ فیض سے فیض یاب ہوئے تھے ایسی قدسی صفات اور تقدس مآب شخصیت کی جذباتی کا غم دلوں میں تازہ تھا جس کو جدا ہوئے صرف ایک سال گزرا تھا۔ تمام غزلیں پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

غزلیں کا ہے کوہیں اپنے استاد حضرت فیض کی ہدائی کے غم میں مرثیہ خوانی ہے
اور کمال فن کا عقیدت مندانہ اظہار ہے۔

ایک نقطہ کا نہیں ہے فرق اس میں لا کلام
حرف استادوں پہ رکھ دیتے ہیں شاگردانِ فیض

(سیر حیات الدین صاف)

تا آتے شاعر دل کو سر بہ سر ہے فیض صاحب
جسے دیکھا جہاں میں لوحہ گر ہے فیض صاحب

[راج بھوج رائے عرف بھولانا تھ عیش]

منور ہو گیا یمن قدم سے سارا گورستان
چراغِ لحد روشن اس قدر ہے فیض صاحب

[راج بھوج رائے عرف بھولانا تھ عیش]

یہ دل کعبہ ہے یا بت خانہ ہے یا بیت المقدس
غرض جو کچھ ہے اے فیاض ہے گھر فیض صاحب

(محمد فیاض الدین خاں فیاض)

شان کمال اوزہد تو صیف برتہ است
این وصف نیست لائق شانِ جنابِ فیض
باقی بسیا بہ مرقد پاکش پے درود
کامین است در زمانہ نشانِ جنابِ فیض

[گردہ باری پر شاد عرف نبی راجہ باقی]

داناے رازء عارف حق، پیر کا ملے
شانِ خدا است رتبہ شانِ جنابِ فیض

[حفیظ الدین پارس]

صفو آخر پر مجدد الدین علی خاں معنی (شاگردِ فیض) کی رباعی صنعت
مستزاد میں حضرت فیض کی مدح میں ہے۔ اس رباعی کے بعد آخر میں مطیع

کارنامہ لکھنؤ کے مالک محمد یعقوب کاردار میں آٹھ سطری لوٹ ہے کہ مجموعہ کلام بلاغت نظام شعرائے دکن کو محمد فیاض الدین خاں صاحب دامنِ ظلہ نے بہر تفریح طبائع شائقانِ مطبع کارنامہ لکھنؤ میں طبع کرایا۔ جو آغاز جمادی الاولیٰ ۱۲۸۵ھ میں طبع سے آراستہ ہوا۔

آخر میں عرض کرنا ہے کہ حضرت فیض کے پہلے عرس سے مشاعرہ کی غزلیات کا یہ مختصر سا مجموعہ نایاب اور کمیاب ہے۔ اگرچہ اس مشاعرہ کو منعقد ہونے سے ایک سو بائیس سال ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ مجموعہ دکن کی شری دادی سرگرمیوں کی مستند دستاویز اور اہل دکن کے ذوقِ سخن اور ان کی تہذیب و شائستگی کی یادگار تصویر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شمعِ سخن ایک سو بائیس سال پہلے نزارِ فیض پر روشن ہوئی تھی۔ اس کی لَوّاح بھی تابندہ و فروزاں ہے۔

حبیب اللہ ذکا کی اُردو، سجو

اعلیٰ حضرت غفران مکانِ لُواب میر محبوب علی خان کے استادِ لُواب سرورِ جنگ کی سوانح عمری "کارنامہ سروری" پڑھ رہا تھا۔ کتاب میں ایک جگہ لُواب سالارِ جنگ مختار الملک ملا المیام حکومتِ آصفیہ کے اوقات کار کا ذکر کرتے ہوئے لُواب سرورِ جنگ مرحوم نے لکھا ہے :

"بالخصوص صلح کے وقت دستارِ برسرِ کمر بستہ چند حاضر باش مثل سید سعد الدین دمولی شیخ احمد داروغہ عبدالوہاب اور ان سب سے زیادہ استادِ رضا علی بجائے اس کے کہ عیب و شکایت کریں ہنسی مذاق کے چند مہذبانہ حرف و حکایت سے وزارتِ پناہ کے جفاکشِ دل دماغ کو خوش اندِ بشاش کرنے اور خود لُواب صاحب ایسے وقت کو فیضیت سمجھ کر ان کے ہنسی مذاق میں حصہ لیتے۔ سید سعد الدین کی نسبت ان

کے ایک ہم وطن مدراسی شاعر نے ایک ہجو بھی منظوم کی تھی اس کا ایک شعر مجھ کو یاد رہ گیا :

کا طہیدن و نوچیدن دہر آنگ پڑیدن
کُتار تو بلی نو تو بندر ز تو آموخت

لؤاب سرور جنگ نے متذکرہ تحفہ کے آخری جملے کچھ ایسے مبہم انداز میں لکھے ہیں کہ پڑھنے والے کے لیے سید سعد الدین، مدراسی شاعر اور اس کی ہجو کا ذکر ایک پیرسلی سے کم نہیں۔ لیکن میں نے جب یہ پڑھا تو میرزہ ن فوراً اپنے حیدر امجد لؤاب مشرف جنگ قیاض کی ایک قدیم بایض کی طرف منتقل ہوا جس میں سید سعد الدین کی شان میں اسی مدراسی شاعر کی اردو میں ہجو اور چند ہجو بہ رباعیاں موجود ہیں۔

سب سے پہلے مجھے یہ بتانا ہے کہ سید سعد الدین عرف چندا صاحب حیدر آباد کے قدیم امراء کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد سید نظام الدین کو لؤاب سر سالار جنگ کے دربار میں بڑی رسائی اور تقرب حاصل تھا۔ سید سعد الدین تعلقداری کے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد معتمد صرف خاص و پیشی مبارک کی حیثیت سے کار گزار رہے۔ سید سعد الدین کے بعد ان کے اکلوتے فرزند سید عبدالرزاق المخاطب لؤاب آصف لؤاب الملک بہادر اس عہدہ جلیلہ پر تاحیات متمکن تھے۔ سید سعد الدین کو بھی لؤاب سالار جنگ کے دربار میں رسائی تھی اور صاحب مغفور کے چند خاص درباریوں میں شامل تھے جیسا کہ لؤاب سرور جنگ نے بتایا۔

مدراسی شاعر جن کا نام لؤاب سرور جنگ نے نہیں بتایا وہ کوئی گمنام شاعر نہیں۔ منشی حبیب اللہ ذکا کو کون نہیں جانتا۔ وہ نیلور (مڈاس) میں سنہ ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ بعمر جوانی سنہ ۱۲۷۲ھ بمید قندھاری حیدر آباد آئے اور سنہ ۱۲۹۱ھ بعمر سینتالیس سال حیدر آباد میں اس دار فانی سے کوچ کیا حیدر آباد آنے کے بعد پہلے لؤاب سالار جنگ کے

محکمہ دارالانشائیں ملازم ہوئے اور آخری زمانے میں لؤاب مغفور کی نوازش سے تعلقداری کی خدمت سے سرفراز ہوئے۔ لؤاب مغفور کی جو ہر شناسی اور قدر دانی کی بدولت ان کے دربار میں بے تکلفانہ رسائی رکھتے تھے ذکا فارسی کے بے عدیل شاعر اور بے مثل ادیب تھے۔ حیدر آباد آئے تو استاد گل حضرت فیضؒ کے شاگرد ہوئے اور استفادہ کیا اور پھر اپنے فارسی اردو کلام پر غالب سے اصلاح لی۔ غالب جیسا ہمہ دان ان کا مداح ہے۔ ذکا کے مجموعہ نظم و نثر ”خاش و خماش“ پر غالب نے تقریظ لکھ کر ان کے علم و فضل سخن دانی اور سخن گوئی کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اردو غزل بھی کہتے تھے لیکن اردو کلام ان کی فارسی شاعری کے رتبہ کو نہیں پہنچتا۔ البتہ قصائد اور مہجوات سے ذہانت، جدت طرازی اور اعلیٰ خیالی کے جوہر چمکتے ہیں۔ طراوت اور بندہ سخی طبیعت ثانیہ تھی خاص کر، بھوکھنے میں طبع جدت پسند رکھتے تھے اس فن میں انھیں ثانی سودا کہیں تو بجا ہے۔

منشی حبیب اللہ ذکا اور لؤاب مشرف جنگ بہادر (محمد فیاض الدین خان فیاض) نے حضرت شمس الدین فیضؒ کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا تھا اور کلام پر اصلاح لی۔ اپنے غیر مطبوعہ لغت ”خزینۃ الاشغال“ کے دیباچہ میں حضرت فیضؒ نے اپنے ان دونوں شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ ذکا اور فیاض میں مراسم دوستی قائم تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ فیاض سید سعد الدین تعلقدار کے حقیقی ہم زلف تھے یہ جو تین بصیغہ راز بیاض ہیں درج ہیں کہ سید سعد الدین صاحب کی طبیعت میں غصہ بہت تھا جہلا ذکا جیسا، بھوگو شاعر یہ کہاں برداشت کر سکتا تھا کئی، جو تین فارسی اور اردو میں سید سعد الدین کی شان میں لکھ ڈالیں۔ پھر بھی اسی بھوکا مقصد ذاتی عداوت نہیں بلکہ نفیس طبع اور خوش طبعی ان کے محرک ہیں اور سب سے بڑھ کر ایسی بھوکا مقصد جیسا کہ لؤاب سردر جنگ بہادر نے تیار وزارت پناہ لؤاب سرسار جنگ کے جفاکش دل و دماغ کو خوش کرنا تھا۔

ذکا کے مجموعہ نظم و نثر "خاش و خماش" میں چند فارسی، ہجوئی ضرورتی ہیں
 اردو، ہجوئیں ناپید ہو چکی ہیں۔ بیاض سے ان کی غیر مطبوعہ ہجو اور ریاضیات
 ہیں۔ یہ اردو کلام بھی بہت نایاب اور یادگار ہے اور غیر مطبوعہ ہے:

کل میں بیٹھا تھا گھر میں اے ہمسرا
 اس میں آکر کسی نے دی آواز

جوہیں میں آ کے دیکھتا ہوں کیا
 آشنائے قدیم ہے اپنا
 بیٹھا دیوان خانے میں جا کر
 کی مدارت حقہ منگو کر

ذکر نکلا ادھر ادھر کا تمام
 لگے آپس میں ہونے کلم و کلام
 پوچھا اچھا تو ہے مزاج شریف
 بدست ادھر کتنے تکلیف

نہیں ملنے کا جب گھلا آیا
 اس طرح تب انہوں نے فرمایا
 تنگ لاتی ہے مجھ کو بیکاری
 یہی اب تو بڑی ہے بیماری

کیا کروں نفس شوم غالب ہے
 ہر طرح زکرت واجب ہے
 ورنہ بڑھ کر ہے اس سے بات کوئی
 دوستوں کی ملازمت سے بھی

رات دن جستجو میں گزرے ہے
 بس اسی گفتگو میں گورے ہے

خالی الذہن میں نے تب یہ کہا
 لے کے چلتے ہیں آپ کو اک جا
 ایک مشفق ہیں میرے سعد الدین
 اپنے پاس آپ کو رکھیں گے یقین
 آج کل ہیں بڑے تعلّق دار
 اور سرکار میں بھی ہیں مختار
 بات اول کی تو بہت ہے دُور
 ان کو فی الجملہ اب تو ہے مقدور
 خوب سوچتی ہے ٹھیک بات ہے ہاں
 آپ اچھی طرح رہیں گے وہاں
 الغرض میں یہ ذکر جب لایا
 قہقہہ مار انھوں نے فرمایا
 وہی نا ان کو میں نے پہچانا
 چندا صاحب بھی عرف ہے جن کا
 اک وہ مشہور ہے زمانے میں
 اک وہ مغرور ہے زمانے میں
 ایک کجخوس ہے وہ نا ہموار
 ایک منخوس ہے وہ بد کردار
 ایک بد ذات ایسا تیسرا ہے
 جانتا ہوں میں اس کو جیسا ہے
 کیا کروں میں صفت اس احمق کی
 صاف صورت ہے بس ہیوتی کسی
 دیکھنے کے ہے قابل اس کی حال
 کہتے ہیں لوگ اسے خردِ حبال

مجھ کو بالفرض لے بھی آپ گئے
ہے یقین بات وہ کسی کی سنے

باپ کو جو نہ لو لے باپ اپنا
کب پڑوسی کو وہ کہے گا چچا
جس کی صورت سے لوگ ڈرتے ہیں
آپ وہاں مجھ کو لے سنے چلتے ہیں

یہ تو ارشاد سعدی شیراز
پیش ازیں کر گئے ہیں بندہ لواز

کس نہ آید بنزیر سایہ لبوم
ورہما از جہان شود معدوم

رباعی

کیوں آپ کو کھچتا ہے تو دور ایتنا
دو دن کی ہوا یہ ہو نہ مغرور ایتنا
کیا کرتا خدا جانے تو جب سعد الدین
اللہ نے دیا نہ تجھ کو مقدم و راتنا

شیخی نہ بگھا ر میرے آگے مطلق
چندا صاحب کہوں گائیں بھی حق حق

(۲)

مشہور کیا ہے خود کو دانا دن میں
رُسیا میں نہیں کوئی بھی تجھ سا احمق

چندا صاحب ہے جس کو عالم کہتا
میں کیا کہوں اسکی خوبیاں ہیں کیا کیا

(۳)

بدخو، بدعہد، بے روت، بے دید
بے دین، بے ہر، بے وفا، بے پردا

(۴) اچھا نہیں چھوڑ سکتی کا انداز
 دوروز کی چاندنی پہ بے جا ہے ناز
 مسموم کے یہ مثل تو چننا صاحب
 لاف میں نہیں خدا کے ہوتی آواز
 (۵) کچھ جھوٹ نہیں ہے بات اس میں سہو
 کیا سانچ کو آئین کس کا ڈر ہے کس کو

بس نام ہے اک بڑا کہ خدا صاحب
 صورت کو ملاحظہ کرو تو آخ ٹھو

اعلیٰ حضرت غفران مکان لواب میر محبوب علیخان آصف کی غزل پر

اعلیٰ حضرت غفران مکان لواب میر محبوب علیخان جس طرح تاجدار
 دکن تھے اقلیم سخن کے بھی بادشاہ تھے۔ آصف تخلص فرماتے تھے۔ لواب بڑا
 خان داغ دہلوی استاد شہید تھے۔ رُجبان طبع غزل گوئی کی طرف مائل تھا
 مینا سے غزل میں داغ کا رنگ سخن جھلکتا ہے لیکن خود آپ کی شاعری
 کا ایک منفرد انداز بھی ہے جس میں شاہانہ وقار کی جلوہ آرائی نمایاں و
 ہے :

رہیں گے ان سے کہی ہم نہ دیکھے آصف

وہ شاہ حسن سہی شہر یار ہم بھی ہیں

تم نے آصف کا نام کیا رکھا

لوگ اس کو حضور کہتے ہیں

حضور کا کلام حیدر آباد دکن کے رسائل اور گلہ سٹوں میں چھپتا تھا
 خاص طور سے بہاراجہ شاد کے جاری کردہ ماہ نامہ ”محبوب کلام“ میں آپ
 کی غزل تصویر کے ساتھ پابندی سے زیور رسالہ ہوتی تھی۔ حیدر آباد

کے مشاعروں، رسائل میں اعلیٰ حضرت غفران مکان کی غزل کا مصرعہ بطور
مصرعہ طرح دیا جاتا تھا جس پر شعراء طبع آزمائی کرتے تھے۔ بعض دفعہ کسی
مشاعرہ کی ”طرح“ پر بھی حضور غزل فرماتے تھے۔

ہمارا جہ شاد نے ایک دفعہ یہ جدت کی کہ مصرعہ طرح پر غزل کہنے
کی بجائے حضور کی غزل پر خمسہ کہنے کی شعراء سے فرمائش کی۔ جس غزل
کا انتخاب ہمارا جہ شاد نے فرمایا اس کا مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے:

سوال وصل پہ نیچی نظر تھی کیا ان کی

ہماری آنکھ میں پھرتی ہے وہ حیا ان کی

ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصف سے

عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا ان کی

مقامی اور بیرونی شعراء نے اس غزل پر جو خمسہ کہے وہ ”محبوب الکلام“

میں شائع ہوئے۔ راقم الحروف نے جس محبوب الکلام کو دیکھا اس کا

اول و آخر صفحہ نہیں ہے اس لیے معلوم نہیں ہوتا کہ کس ماہ اور سنہ کا ہے

بہر حال اپنے اپنے مقطع میں شعراء نے جن عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار

کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان

صرف نام کے محبوب نہ تھے بلکہ سچ مح ”محبوب الخلائق“ تھے مقطع پر

چند خمسے پیش ہیں۔

[۱] ہمارا جہ شاد

خزینہ ہائے پیر از زر ہمن کورڈ ملے

نہلنے گوہر خوشی آب بے شمار دیئے

رہے نصیب کہ ہم شاد شاد شاد ہوئے

ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصف سے

عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا ان کی

[۲] ملے ہماری لعل رمز حیدر آبا دی۔

دکن کے شاہ ہیں سرتاج ہیں دو عالم کے
ہیں ان کے فیض کے لیے رنر چار سو چرے
زیادہ اس سے بھی پایا جو تم سے سنتے تھے

ملے تھے آج تو ہم بھی
عجیب رنگ میں ہیں

[۳] محمد عبداللہ خان ضیغم لکھنوی

وہ ساتیاں سمن بر کے جھگٹے دیکھے
پری جمال ہزاروں تھے روبرو بیٹھے
خدا کی شان ہے ضیغم انھیں خدا رکھے

ملے تھے آج تو ہم بھی
عجیب رنگ میں ہیں

[۴] بادشاہ علی ضیا لکھنوی .

جناب شاد نے رتبے یہ شاعروں کو دیئے
غزل کو شاہ کی خمس کیا ضیا سب نے
جسے سنو یہی فخر یہ کرتا ہے دعوے

ملے تھے آج تو ہم بھی
عجیب رنگ میں ہیں

[۵] میر احمد علی عصر حیدر آبادی .

طریقے یاد ہیں کیا خوب ملک لانی کے
ہر اک جواب تھا برجستہ بر محل فقرے
عقل عصر نہ دیکھے کہیں نہ اسے سنے

ملے تھے آج تو ہم بھی
عجیب رنگ میں ہیں

[۶] حبیب کنٹوری لکھنوی .

خدا گواہ یہ ماموں ہیں رمانے کے
نظام ملک و ملل آپ سے کوئی لو جھے
بڑے بڑوں کو سنا ہے جیب یہ کہتے
ملے تھے آج تو ہم بھی
عجیب رنگ میں ہیں

[۷] نواب عزیز یار جنگ عزیز -
عزیز اور صاحب تحفے ہاتھ باندھے کھڑے
جب ان کے آگے پڑھے شاعروں نے یہ فہمے
سخن کی داد وہ دیتے تھے لے لے تھے نہ
ملے تھے آج تو ہم بھی
عجیب رنگ میں ہیں

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا خط

نواب عزیز یار جنگ عزیز کے نام

بعض خط ایسے ہوتے ہیں جن کا مفہوم اور اشارات صرف اس خط کے
لکھنے والے [کاتب] اور مخاطب پڑھنے والے (مکتوب الیہ) کو ہی معلوم
رہتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے اس پیچ دار گفتگو کا سمجھنا پہیلی ہو جھنسنے
کم نہیں ہوتا۔ مہاراجہ بہادر کا یہ خط کچھ اسی انداز کا ہے۔ راقم الحروف
تھوڑی بہت واقفیت خط کے مفہوم سربستہ سے رکھتا ہے۔ اس لیے
اظہار خیال کی جرأت کی ہے۔

مہاراجہ بہادر نے یہ خط نواب عزیز یار جنگ عزیز کو لکھا ہے۔
نواب عزیز یار جنگ نواب مشرف جنگ فیاض مددگار معتمد صرف خاص
کے فرزند اکبر اور جناب سید عبدالرزاق المخاطب، آصف نواز الملک معتمد

صرف خاص کے داماد تھے۔ طبقہ امراء میں شمار ہونے سے علاوہ ناظم عدالت ضلع اطراف بلدہ کی حیثیت سے ایک قابل جرائد اور نامور عہدہ دار ہوئے ہیں۔ وہ استاد داغ سے فیض یافتہ ایک خوش فکر شاعر و شاگرد اور مکتب درخ سے قادر الکلام استاد سخن بھی تھے۔ دربار شاد میں لڑا بہار جنگ کی بڑی رسائی اور عزت تھی۔ بہاراجہ بہادر سے روابط مخلصانہ رکھتے تھے۔ بہاراجہ کے دور میں جب شاد کلب قائم ہوا تو لڑا بہار کلب کے آئینہ سکرٹری کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔ بہاراجہ سے خلوص اور عقیدت کو آخر وقت تک نبھایا۔ بہاراجہ کے انتقال (سنہ ۱۹۲۰ء) کے بعد بھی بزم شاد کے مشاعروں میں باوجود ضعفی میں نے خود لڑا بہار جنگ کو شرکت کرتے اور حصہ لیتے دیکھا ہے۔

جس مشاعرہ کا خط میں ذکر ہے وہ عرس حضرت فیض کا مشاعرہ ہے لڑا بہار مشرف جنگ فیاض اپنے استاد حضرت شمس الدین محمد فیض کے انتقال (سنہ ۱۸۳۵ء) کے بعد سے ہر سال ۱۲ رجب کو عرس اور طرحی مشاعرہ کا اہتمام اور انتظام بڑی عقیدت مندی اور مستعدی سے مزار پر اور حضرت فیض واقع بیرون لال دروازہ پر تقریباً (۲۵) سال تک کرتے رہے۔ طرحی (فارسی و اردو) غزلیات کا مجموعہ گلدستہ فیض کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ جو شاعر مشاعرہ میں شرکت سے مجبور رہتے وہ ذریعہ ٹیپہ جناب فیاض کو اپنی غزل بھجواتے تھے تاکہ شریک گلدستہ ہو۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد لڑا بہار نے مزید پانچ سال تک عرس حضرت فیض اور طرحی مشاعرہ کی روایت کو جاری اور قائم رکھا۔ حضرت فیض کے ان مشاعروں میں مقامی اور بیرونی اساتذہ سخن اپنے شاگردوں کے ساتھ شریک بزم مشاعرہ ہوتے تھے۔ طبقہ امراء سے لطف یا اور الملک وزیر بہاراجہ کشن پر شاد شاد، راجہ گردھاری پر شاد عرف بنسی راجہ باقی، صولت جنگ غازی، عظام الدولہ دارا، اقبال یار جنگ اقبال، لقمان الدولہ دل اور صادق جنگ محکم وغیرہ ان مشاعروں میں شریک کر

غزل سنانے کو اپنی سادات سمجھتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں مہاراجہ شاد نے اپنی غزل سے پہلے ایک رباعی سنائی تھی ہے

آصف کا غلام حسانہ زاد آیا ہے
ہاں فیض سے پانے کو مُرد آیا ہے
اک دھوم مچی ہے انگلیاں اٹھتی ہیں
صحت میں مشاعرہ کی شاد آیا ہے

جس مشاعرہ کا خط میں مہاراجہ بہادر نے ذکر کیا ہے وہ عرسِ حضرت فیض کا ۱۲ رجب المرجب سنہ ۱۳۲۹ھ کا مشاعرہ ہے۔ جس کا اہتمام انتظام نواب عزیز یار جنگ نے کیا تھا۔ اس مشاعرہ کی فارسی طرح تھی، سوختن پر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

اور اردو طرح :-

حضرت فیض کا ہر وقت کرم ہوتا ہے
مہاراجہ شاد نے فارسی طرح پر سات شعر اور اردو طرح میں گیارہ شعر فرمائے تھے۔ اردو کے چند شعر پیش ہیں۔

دہی ہوتا ہے جو قسمت میں رقم ہوتا ہے
نہ تو ہوتا ہے سوا اس سے نہ کم ہوتا ہے
ٹیس جب ہوتی ہے دل میں تو نکلتے ہیں اشک
یاد جب آتی تری مجھے غم ہوتا ہے
جس پر اسے شاد ہوا کرتا ہے فضل خالق
پھر تو موجود وہیں جاہ و چشم ہوتا ہے

مہاراجہ شاد نے اپنی غزلیں روانہ کی تھیں شریکِ بزمِ مشاعرہ نہیں ہوئے خط سے واضح ہے کہ وہ منتظر رہے کہ حسبِ عادت نواب عزیز یار جنگ یا آصف یا در الملک بلائیں تو مشاعرہ میں جاویں۔ خط سے اتداء میں آصف یا در الملک کا نام آیا ہے۔ نواب صاحب

نام میر وزیر علی خاں ہے۔ وہ خاندان آصفی سے تعلق رکھتے تھے۔ لؤاب انصل الدولہ کی صاحب زادی سراج النساء بیگم صاحبہ آپ کی محل تھیں۔ برقرار جنگ آصف یار الدولہ اور آصف یار الملک کے خطابات غفران مکان لؤاب میر محبوب علی خاں نے عطا کئے تھے۔ اقربات سے سہارا ہونے کے علاوہ بڑے فقیر منش، وضع دار اور رتبہ کے امیر تھے۔ شعر و سخن کا ذوق تھا۔ اور وزیر نخلص فرماتے تھے۔ حضرت میر احمد علی عصر حیدر آبادی کے شاگرد تھے۔ حضرت فیض کے شاعروں میں ذوق و شوق اور عقیدت مندی سے حاضر ہوتے تھے۔

خطبیں بہاراجہ بہادر نے اپنے فرزند آصف پر شادکی وقات کا ذکر کیا ہے اور ایک جلد "فریاد شاد لؤاب عزیز یار جنگ کو بھیتے ہوئے فرمایا کہ ان کے فرزند کے غم کا مرثیہ ہے۔ بہاراجہ کو مختلف بیویوں سے تیرہ لڑکیاں اور سات لڑکے پیدا ہو چکے تھے۔ چار لڑکیوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت نو زندہ تھیں۔ البتہ سات لڑکے سال دو سال کی عمر پا کر یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دے چکے تھے۔ اولاد نیربہ نہ ہونے سے بہاراجہ کو شدید غم اور دکھ ہوتا تھا۔ مالوسی کا احساس ہوتا تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو دلاسا دیتے :

ہاتھ سے دامن امید نہ چھوٹے اے شاد

جس نے یہ داغ دیا ہے وہی مریم دے گا

آخر ان کی دُعا سحر کی قبولیت کا وقت آیا۔ دوسری رات کے بطن سے ۱۳۲۸ھ لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام غفران مکان لے لیا۔ پیر شاد رکھ کر عزت افزائی فرمائی۔ بہاراجہ کو اس لڑکے کی پیدائش پر بڑی مسرت اور شادمانی ہوئی۔ بہاراجہ کی تاریخ پیدائش (۱۲۸۰ھ) کے حساب سے اس وقت ان کی عمر (۲۸) سال تھی۔ جب آصف پیر شاد ۱۱ عمر ایک سال کی ہوئی تو وہ بیمار ہوئے۔ گلے پھول گئے اور بیمار لے لے لگا۔

اس وقت کے دستور حکمرانی اور مہاراجہ پر الطاف شاہانہ کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خود غفران مکان محبوب علی پاشاہ نے مہاراجہ کی ڈیوٹی آکر آصف پرشاد کی مزاج پرسی کی اور پھر اس وقت کے ریڈیٹ سسر چارلس ہیلی نے بھی ایسا ہی کیا۔ تمام بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج ہوا۔ غورتوں کے کہنے سے غاملوں کو بھی دکھایا۔ درگاہوں پر حاضری دی۔ بزرگوں محذوبوں اور مہنت و پندت کے پیڑل نیرانی بگڑی اُتار کر رکھی اور دُعاء کے طالب ہوئے۔ سمجھوں نے سچہ کے جینے کی اُمید دلائی لیکن موت کا وقت طل نہ سکا اور آصف پرشاد کا ۱۲ صفر ۱۳۲۹ھ انتقال ہو گیا۔ مہاراجہ نے اس موقع پر بڑی حسرت و یاس سے لکھا ہے "آصف پرشاد جس کی سگ ہوئے کی تاریخ تھی اس کی عمر کی آخری سال گرہ ہو گئی۔ اب کوئی گرہ نہ پڑے گی۔ ایک سال ہی میں عمر طبعی ختم ہو گئی؟ مہاراجہ کو جب بتایا گیا کہ آصف پرشاد کی زندگی کا چراغ گل ہو رہا ہے تو شدت غم سے اپنے لونہال کی صورت دیکھے بغیر سرکار کی اجازت لے کر لونگ آباد روانہ ہوئے۔

"فریاد شاد" مہاراجہ کے اسی فرزند کا مرثیہ ہے جو بطرز شہسوی لکھا گیا ہے۔ مہاراجہ اس شاہی دور میں پیشکار، وزیر فوج اور وزیر اعظم کے علاوہ بڑے وضع دار امیر بھی تھے۔ وہ مشرقی تہذیب و شائستگی کا بے مثال نمونہ تھے لیکن اولاد کا غم امیر و فقیر اور شاہ و گدا کے لیے فطرتاً یکساں ہے۔ "فریاد شاد" کے آئینہ میں مہاراجہ بہ چشم گریباں، چاک گریباں اور خاک بر سر نظر آتے ہیں۔

غم سے فرزند کے ہے دل ناشاد
کس سے ترے سوا کر دل فریاد
آرزو تیں جو تھیں ہوئیں بریاد
ہو گیا شاد و فعتہ ناشاد
نہیں اب تاب غم کے سہنے کی
نہیں طاقت زبان سے کہنے کی

جی میں آتا ہے خوب سر بیٹوں
 مار کر ڈھاریں خوب سا روں
 جیب و داماں کو اپنے چاک کر دوں
 خاک کو لے کے اپنے سر پہ ملوں
 خود کشی کا خیال آتا ہے
 غم کلیجہ کو کھاتے جاتا ہے
 نام اس کا وظیفہ میرا ہے
 کیا بہوا دل کو حال یہ کیا ہے

خط پہ کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن فریاد شاد سنہ ۱۳۲۹ھ کو طبع ہوئی۔ مشاعرہ اسی سال ۱۲ رجب کو ہوا۔ اغلب یہی ہے کہ رجب کی آخری تاریخوں میں خط لکھا ہوگا۔ خط میں جن اشعار کو رشتہ دوز کرنے کا ذکر ہے وہ اشعار دستیاب نہیں۔

شاعری میں مہاراجہ شاد کے استاد

نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے مہاراجہ بہادر شاد کی سوانح عمری بعنوان ”مہاراجہ کشن پر شاد“ سنہ ۱۹۵۰ء میں مرتب و شائع کی یہ تذکرہ بہت مستند ہے کیوں کہ اسے ایسی شخصیت نے مرتب کیا جس کے مہاراجہ سے بچ کے اور سرکاری روابط بہت قریبی تھے۔ باب دوم ص ۲۷ میں مہاراجہ کے خود نوشتہ حالات کا اقتباس درج ہے۔ اپنے خود نوشتہ حالات زندگی میں مہاراجہ شاد نے اپنے ان اساتذہ سخن کا ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے اپنے فارسی اور اردو کلام پر اصلاح لی ہم نے اپنے مضمون کی تیاری میں اسی خود نوشتہ کو پیش نظر بنایا ہے۔

مہاراجہ شاد سنہ ۱۲۸۰ھ [بابت سوا سی ہجری] میں فرخندہ بنیاد

حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ میں جب کہ ان کی عمر تیس (۳۰) سال تھی اپنی شاعری کی ابتداء کی۔ اول اول فارسی میں شعر کہنے لگے کیونکہ اس زمانہ میں فارسی زبان کا چلن زیادہ تھا۔ پھر اردو میں طبع آزمائی کر کے مشق سخن کو آگے بڑھایا۔

رائے سچو لال تمکین حیدر آبادی، استاد کل حضرت شمس الدین **رائے سچو لال تمکین** محمد فقیہ کے تہذیب یافتہ شاگرد تھے۔ فارسی میں

شعر کہتے تھے اور قادر الکلام استاد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد راجہ گردھار کی پرشاد بائی [عرف بمی راجہ] نے سنہ ۱۳۰۲ھ [تیرہ سو دو ہجری] میں ان کا سلام مرتب کر کے ”لنگارستان تمکین“ کے نام سے شائع فرمایا۔ تمکین بنایا شاعر ہونے کے علاوہ ایک ماہر فن خطاط بھی تھے۔ مہاراجہ نے ان سے خطاطی بھی سیکھی تھی۔ مہاراجہ فرماتے ہیں :

”میں نے سچو لال تمکین سے جن کا ذکر قبل از این ہوا ہے اصلاح سخن کی بنیاد ڈالی۔ علاوہ فارسی کے اردو میں بھی ابتداء ان ہی سے کی۔“

مہاراجہ کی اصلاح سخن کا سلسلہ زیادہ مدت تک **عبد العلی وآلہ** قائم نہ رہ سکا کیوں کہ تھوڑے دنوں میں جناب تمکین کا انتقال ہو گیا استاد کے مرنے کا مہاراجہ کو کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ انھوں نے کئی دنوں تک شعر گوئی ترک کر دی۔ جب مدرسہ عالیہ میں بغرض تعلیم شریک ہوئے تو شاعری کی طرف مائل و متوجہ ہوئے اور اس وقت عبد العلی وآلہ سے مشورہ سخن کیا۔ عبد العلی وآلہ ”مدرسہ عالیہ“ میں عربی و فارسی کے استاد تھے۔ شاعری فارسی میں کرتے تھے ان کا دیوان ”چمنستان بہشت“ کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔ اپنے فارسی تذکرہ سخنورانِ چشم دید میں جناب ترک علی شاہ ترکی نے آلہ کے علم و فضل کے بارے میں لکھا ہے کہ ”مردم ایران دیندستان آن مجمع صفات را سعدی دکن فی گفتند۔“

نام اور تخلص وہی ہے
مولانا مولوی نور الضیاء الدین ضیاء | جو زیب عنوان ہے۔

لواب ضیاء یار جنگ بہادر خطاب۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور اسی خاک پاک میں پیوند زمین بھی بھٹی مجلس عالیہ عدالت حکومت حیدر آباد تھے۔ جناب ضیاء فارسی کے عظیم النظیر استاد سخن تھے دکن کے قدیم رسائل میں ان کا کلام بلاغت نظام بکھرا پڑا ہے مگر افسوس کوئی قلمی یا مطبوعہ دیوان موجود نہیں۔ بہاراجہ جناب ضیاء کے یارے نہیں کہتے ہیں۔

”علم و فضل میں باکمال ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا ہے کبھی کبھی کوئی غزل یا رباعی لکھ لیتا ہوں تو مولانا نور الضیاء الدین المتخلص ضیاء کو دکھا لیا کرتا ہوں“

ترک علی شاہ ترکی | ترک علی شاہ ترکی اعلیٰ حضرت غفران مکان لواب میر محبوب علیخان کے عہد میں پنجاب سے حیدر آباد آئے۔ ازراہ قدر دانی سرکار سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا فارسی شاعری کے بلند مرتبہ استاد مانے جاتے تھے کبھی کبھی اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ فن عروض میں مسلم مرتبہ رکھتے تھے۔ صاحب دیوان اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کا فارسی تذکرہ ”شخوڑان چشم دیدہ“ دنیا سے ادب میں اہم اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہاراجہ لکھتے ہیں: ”جب کبھی مولوی صاحب (ضیاء یار جنگ) اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اورنگ آباد جاتے ہیں تو ترک علی شاہ المتخلص ترکی سے مشورہ کیا کرتا ہوں“

مولانا مظفر الدین معلیٰ | مولانا مظفر الدین معلیٰ محمد آباد بدیر میں پیدا ہوئے اور شہر حیدر آباد میں آسودہ خواب میں بحیثیت مددگار ناظم سپہ خانہ جات حکومت سرکار عالی کے عہدہ پرنائز رہ کر

اٹھ سال کی عمر میں سنہ ۱۳۳۵ھ [تیرہ سو پینتیس ہجری] دنیا سے رخصت ہوئے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فن شاعری میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا دیوان ”ریاضِ معنی“ ان کے فرزند نے ان کے انتقال کے بعد سنہ ۱۳۴۰ھ [تیرہ سو چالیس ہجری] میں زیورِ طبع سے آراستہ کرایا۔ بہارِ جہ رنم طراز ہیں:

”اردو میں محمد مظفر الدین صاحب جن کا تخلص معنی ہے ان کو غزل دکھا کر تا تھا اپنے استاد کا تعارف بہارِ جہ یوں کرتے ہیں:

تم معنی کو نہیں پہچانتے؟
شاعری میں شاد کا استاد ہے

حضرت غفران مکان کے آگے بہارِ جہ شاد نے زانو تلمذ نہ نہیں کیا جیسا کہ مرقع سخن جلد اول میں بہارِ جہ پر لکھے گئے

اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب
میر محبوب علی خان آصف

مضمون میں ذکر کیا گیا ہے واقعہ یہ ہے کہ بہارِ جہ مشرقی تہذیب و شائستگی کی منہ بولتی تصویر تھے آداب دربارِ دہلی کے رموز سے کما حقہ واقف تھے اس لیے جب غفران مکان نے ان کی غزل کے ایک شعر میں ایک لفظ کی اصلاح کی تو اس اصلاح کو اپنے لیے بادشاہ سے نسبت شاگردی کو صد ہزار جاہ و منصب جانا چنانچہ فرماتے ہیں:

”ایک شعر میں قاش غلطی تھی۔ اپنی خطا پوش نظر سے اس کی اصلاح فرمائی۔ میں نے قدم چومے اور سرفرازی کی نذر پیش کی اور متمنی ہوا کہ شاد [شاد تلمیذ آصف] لکھے جانے کی اجازت ملے سنہ ۱۳۱۶ھ (تیرہ سو سو ہجری) میں شاگردی کے خطاب سے سرفراز ہوا۔“

کس فخر و ناز سے کہتے ہیں:

گو شاعری سے مجھ کو سود کار ہی نہیں
پر فخر کیا یہ کم ہے کہ شاگردِ شاہ ہوں

نواب مرزا خان داغ دہلوی | استاد داغ کے شاعرانہ کمال و فن پر ہماری لب کشائی چھوٹا منہ بڑی بات

کے مترادف ہے۔ خود مہاراجہ اطلب اللسان ہیں کہ،

حضرت داغ سلمہ کا آفتاب دکن میں چمکا۔ ان کے کلام کی دھوم مچی جو طرف ان ہی کے کلام کے وصف کی صدا میں بلند ہونے لگیں۔ ایسی سادگی و پُرکاری شعر گوئی میں دوسرے کو کہاں نصیب ہو سکی۔ میں نے بھی ابتداء میں ان ہی کے سراستادی کا سہرا باندھا۔ اس اثنا میں میری مشق اردو میں ایک حد تک استاد کے اطمینان کے لائق ہو گئی۔“

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل | دُنیاۓ شاعری میں سُخن سبھی اور غزل گوئی میں

جو ہمہ گیر مقبولیت استاد جلیل کو ملی وہ بہت کم شعراء کے حصّہ میں آئی۔ مہاراجہ نے استاد داغ کی وفات سنہ ۱۳۲۲ھ (تیرہ سو بائیس ہجری) کے بعد جناب جلیل سے مشورہ سُخن کیا جامعہ عثمانیہ کے میگزین جلیل نمبر میں شاد کے کلام پر جلیل کی اصلاحیں موجود ہیں ممتاز ادیب و نقاد جناب منظور احمد منظور نے اپنے مضمون ”مہاراجہ کشن پرشاد“ میں علامہ عبداللہ عادی، علامہ شوشتری اور مسعود علی محوی کو بھی ان استادہ میں گننا ہے جن سے مہاراجہ نے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ مہاراجہ میں کس بات کی کمی تھی؟ قسّام ازل نے منصب جاہ و اقبال سے نوازا انھیں ہر فن میں صاحب کمال اور بڑے عالم فاضل تھے۔ طرز خاص کے انشا پر واز اور ہمہ شاعر تھے۔ ریاست حیدرآباد جیسی بڑی مملکت کے سب سے بڑے عہدہ پر فائز تھے لیکن سادگی، خاکساری اور انکساری ان کی سیرت کے کچھ ایسے تابناک اور نمایاں اوصاف تھے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو شاگرد کی حیثیت سے پیش فرماتے تھے جب کہ وہ خود استاد کمال تھے داغ کا یہ شعر مہاراجہ پر لوہا اترتا ہے:

آپ اپنے کو جو شاگرد کا شاگرد گئے
داغ سا ہم نے تو استاد نہ دیکھا سنا

مہاراجہ شاد کی تاریخ وفات

نصف صدی کا قصہ ہے یہ دو چار برس کی بات نہیں لیکن پچھری مہاراجہ بہادر کو دیکھنے والے لوگ ابھی بقید حیات ہیں۔ مہاراجہ بہادر سرشن پرشاد شاد یمن السلطنت ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست سلطنت آصفیہ کے شیکار اور حدراً عظم تھے۔ ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد کئی کتابیں اور مضامین ان پر محققین و مورخین نے لکھے۔ وہ کوئی گمنام شخصیت نہ تھے لیکن تعجب ہے کہ سوانح نگاروں نے جو تاریخ وفات ان کی لکھی ہے ان میں اختلاف موجود ہے۔ مثلاً

۱۔ لواب مہدی نواز جنگ کی مرتبہ سوانح عمری ”مہاراجہ کیشن پرشاد“ بڑی معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ لواب صاحب لکھتے ہیں،

۱۔ [۴] ربیع الآخر سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق (۳) مئی ۱۹۴۰ء موافق (۸) تیر ۱۳۵۹ ف روز دوشنبہ انھوں نے متاع جان کو حقیقی مالک کے حوالے کر دیا۔ ۲۵

۲۔ جناب سید مظفر حسین برنی صاحب کلیات مکاتیب اقبال ”جلد اول میں رقم طراز ہیں، “ (۹) مئی ۱۹۴۰ء کو انتقال ہوا۔ ۹۳۹

۳۔ جناب راج سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ نے اپنی سولفہ تاریخ ”ہند کرہ دربار حیدر آباد“ میں مہاراجہ شاد کی تاریخ وفات یہ لکھی ہے:

[۸] تیر ۱۳۴۹ ف م [۳] جولائی ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ دن کے چار

بج کر پانچ منٹ شام مہاراجہ نے انتقال کیا۔ ۲۳۱
۴۔ جناب ڈاکٹر حبیب ضواء صاحب کانی۔ ایچ۔ ڈی کا انتقال ”مہاراجہ شاد“

حیات اور ادبی خدمات“ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے بوضوح کی تحقیق

یہ ہے:

”[۱۸] تیر ۱۳۲۹ ف م ۱۹۳۹ء روز دوشنبہ (۷۶) سال کی عمر میں

انتقال کیا“ ۳۱

۵. راقم الحروف کے تایا جناب محمد کریم الدین خان صاحب مرحوم سالت
تخصیص دار و نگل کی بیاض میں مبارکہ بہادر کی تاریخ وفات اس طرح درج
ہے :- ”تاریخ (۵) ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ (۸) تیر ۱۳۲۹ ف م (۱۳)
مئی ۱۹۴۰ء یوم دوشنبہ بوقت چار ساعت شام مبارکہ سرکش پرشاد
مین السلطنت کا انتقال ہوا“

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آخر کس تاریخ وفات کو درست اور صحیح
سمجھا جائے ہم نے مبارکہ بہادر کی تاریخ وفات کے دو ماخذ دیکھنا کافی جانا۔
ایک اعلیٰ حضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کا فرمان
مبارک جو مبارکہ کے انتقال پر جریدہ نمبر معمولی میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا
ماخذ اس دور کا مشہور اردو روزنامہ ”رہبرِ دکن“ ہے جس میں مبارکہ بہادر
کے انتقال کی تفصیلی خبر موجود ہے۔ فرمان مبارک کا پہلا جملہ یہ ہے:

”افسوس کل مبارکہ سرکش پرشاد مین السلطنت کا انتقال ہو گیا۔“
فرمان مبارک کے آخر میں تاریخ (۶) ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ لکھی ہوئی ہے۔

اخبار رہبر دکن میں تاریخ وفات (۵) ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ (۸) تیر ۱۳۲۹ ف
(۱۳) مئی ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ م بیچ کر تین منٹ بتائی گئی ہے۔ اس لحاظ سے
بیاض میں درج مبارکہ شاد کی تاریخ وفات بالکل درست اور مستند ہے۔ اب
قابل غور یہ ہے کہ دکن کی معروف شخصیت کی تاریخ وفات لکھنے میں مورخین
نے اتنی واضح فروگزاشتیں کی ہیں جس کو انتقال کہے ہوئے صرف پچاس
برس ہوئے ہیں تو چار سو سال کے تاریخی واقعات کس حد تک مستند ہیں
اور کس حد تک تحقیق طلب ہوں گے؟

معشوقہ سرشار مکرم

اردو کے مایہ ناز ادیب اور شاعر نڈت رتن ناتھ سرشار جب سنہ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد دکن وارد ہوئے تو بہاراجہ سرکش پرشار شاد مدارالمیاد دولت آصفیہ نے ان کو اپنا مہمان بنایا اور بڑی قدر دانی کی سرشار زندہ دل ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بلا نوش بھی تھے۔ طبیعت رنگین اور مزاج عاشقانہ تھا۔ مولاجان طوائف سرشار کی منظور نظر تھی جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی! اس زمانہ میں راقم کے والد محمد رحیم الدین خان صاحب رحیم بر بنائے روابط قدیم بہاراجہ بہادر کے دربار میں جایا آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہاراجہ نے ان سے مولاجان کا سراپا کھینچنے کی فرمائش کی۔ بہاراجہ کے پیش نظر شاد اپنے مہمان سرشار کو خوش کرنا تھا۔ تعمیل حکم میں انھوں نے مولاجان کا سراپا تو لکھا لیکن سراپا کو طنز و مزاح کے گل بوٹوں سے سزا اور بہاراجہ بہادر کی ایک خاص محفل میں جناب سرشار اور مولاجان کی موجودگی میں سنایا۔ سرشار خاموش سراپا سُنتے رہے اور مسکرا کر داد بھی دی لیکن مولاجان اس سرتاپا آگ بگولہ ہو گئی۔

ساتی مئے گل رنگ کا اک آدھ پیالا

صدقے ترے میجانے کے لاجلہ ہمیں لا

ہونٹہ مگر نشہ میں ہوتا زہ کرامت

ہو کیف مگر کیف میں ہو کیف نرالا

یہ کیوں کہ سراپا مجھے لکھا ہے ادھر سن

ہے جس کی جوانی میں ضعیفی کا تختہ لا

وہ کون کہ معشوقہ سرشار مکرم

وہ کون کہ ہے نام بخش جس کا مولا

تضہین فرمائی۔ اعلیٰ حضرت کی سات شعروں پر مشتمل اس مشہور و معروف غزل میں مصرعہ اولیٰ تو مصرعہ نہدگان عالی ہے۔ اور ثانی مصرعہ رسا کا ہے۔ صرت تین مصرعوں میں خط کشیدہ لفظ کی حد تک اختلاف ہے۔ مخفی مباد کہ جناب رسا نے اس وقت اپنی یہ نظم سنائی تھی جب حضور نظام کی عمر ان کی پیدائش ۱۳۱۷ھ کے لحاظ سے صرت گیارہ سال تھی یاد شاہ ہونے کے بعد اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ غزل ارشاد فرمائی تھی لا رب حضور کی تضہین سے لطیف غزل دو بالا ہو گیا۔

رسا (رسوا)	بہت سی شکلیں جھیلی ہیں اس غفلت کے ہاتھوں سے ابھی حصہ میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی
شاہ عثمان	محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و لڑان باقی ابھی حصہ میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی
رسا (رسوا)	مسلمانوں کو چو نکو چلو کس نیند سوتے ہو نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گران باقی
شاہ عثمان	شب و دوشینہ کی بد مستیاں میں کیا کہوں ساقی نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گران باقی
رسا (رسوا)	مسلمانو یہ طوفان اور یہ غفلت اور یہ کشتی نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادبان باقی
شاہ عثمان	خدا ہی کشتی دل کا ہے حافظ بحر الفت میں نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادبان باقی
رسا (رسوا)	کہاں تک قوم کا لڑھکے نہیں گئے آپ رسوا شب آخر ہو چکی لیکن ابھی ہے داستان باقی
شاہ عثمان	زبان شمع سے سننا ہوں قصہ سوز الفت کا شب آخر ہو چکی لیکن ابھی ہے داستان باقی

رتسا (رتسوا)

شاہ عثمان

رتسا (رتسوا)

شاہ عثمان

رتسا (رتسوا)

خدا کا نام لے کر منزل مقصود حسیل نیکلو !
 غنیمت ہے کہ اب تک ہے نشان کاروان باقی
 سراغ آخر کو بل ہی جائے گا یا ران رفتہ کا
 غنیمت ہے جو اب تک ہے نشان کاروان باقی
 لیا ب صفت و حرمت کا حصہ خوشہ چینیوں نے
 مگر جو حید کے لب پر رہ گئی آہ و فغان باقی
 گل و ریچان و سنبل ب خزاں میں ہو گئے رخت
 مگر بلبیل کے لب پر رہ گئی آہ و فغان باقی
 دکھائے طبع جو ہر مدح سلطانِ دکن میں کچھ
 ابھی ہے تری جوت کا بہت سا امتحان باقی

رتسا (رتسوا)

شاہ عثمان

کہ جس کے عہدِ نہشت میں ہم شاد و خرم ہیں
 مسلمانوں کا جس کی سلطنت سے ہے نشان باقی
 سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذر اجل عثمان
 مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشان باقی

بے نظیر شاہ وارثی کو بلا طلب و سوال و طیفہ

اردو زبان کے شاعر بے نظیر شاہ وارثی واقعی شاعر بے نظیر تھے۔ کٹر الہ آباد کے متوطن اور حضرت امیر مینائی کے شاگرد غزل میں ان کا ایک منفرد رنگ تھا۔ انچرل شنوایاں اور نظمیں خاص انداز کی کہہ کر اس اردو کو بہت کچھ لوازا ہے مشرب فقیرانہ مفا اور زندگی متوکل علی اللہ حق۔ استاذی محترم محمد اکبر الدین صدیقی صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ (ذلیفہ باب) نے سنہ ۱۹۵۸ء میں ”کلام بے نظیر“ کے عنوان سے بے نظیر شاہ کے فرزند سید حامد بے نظیر کے تعاون سے ان کا کلام مرتب و شائع فرمایا ہے۔ سوانح عمری انداز کے مقدمہ میں بے نظیر شاہ کے حالات زندگی بھی بیان فرمائے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوا کہ پہلی مرتبہ بے نظیر شاہ سنہ ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد تشریف لائے تھے اور سنہ ۱۹۰۹ء میں واپس ہو گئے۔ دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۱۹ء حیدر آباد آئے۔ جب حضور آصف صاحب درنگل گئے تو لاداب قطب یار جنگ تعلقہ دار نے بے نظیر شاہ کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیا یہ بے نظیر شاہ نے قصیدہ سنایا تو حضور نے پسند فرمایا۔ پھر اس کے بعد بے نظیر شاہ نون طلب پر کتاب ”گنجینہ عثمانی“ لکھ کر قصیدہ کے ساتھ خدمت اقدس میں گدانا تھا۔ محترم صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

”مولانا ۱۹۲۱ء میں اپنے بچوں سے ملنے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ اثنائہ میں کچھ دن بھی یہی قیام کیا۔ کئی ایسے خطوط موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت نظام رکن نے انھیں حیدر آباد طلب کیا لیکن مولانا نے خیرانی صحت اور بچوں سے ملنے کے اشتیاق کا عذر کیا اور

علی گڑھ پہنچے، (۴۴) سنہ ۱۹۳۲ء میں وہ حیدرآباد لوٹے۔ یہاں آکر بیمار ہو گئے اور پھر اسی سنہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بے نظیر شاہ پر کئی اہل علم اصحاب اور ان سے قریبی ربط رکھنے والے احباب نے مضامین لکھے ہیں لیکن تعجب ہے کہ کسی نے بھی اس وظیفہ کا تذکرہ نہیں کیا جس کو اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع نے برہم خسروانہ بے نظیر شاہ کو تاحیات دینے کا فرمان نافذ کیا۔ اس وقت ہمارے پیش نظر آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کی فائیل قسط (۸۰) فہرست (۱) نشان سلسلہ (۱۳) موجود ہے جس میں اس عطیہ سلطانی کی روداد درج ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مانگنے والوں کو تو سب ہی دیتے ہیں لیکن بے مانگے کسی کی امداد و حاجت روائی کمال کرم ہے ایسی مثالیں زمانہ قریب کے فرماں روا سے دکن حضور آصف سابع لواب میر عثمان علی خان کے عہد زرین میں ملتی ہیں۔ شاہ عثمان کی علمی سرسپتوں اور شبانہ روز فیاضیوں کا سارے ہندوستان میں شہرہ تھا۔ نامی گرامی علماء و فضلاء اہل حاجت اور مستحقین امداد سب ہی کشان کشان چلے آتے تھے مگر بے نظیر شاہ نے کسی متوسل دربار سے شاہ دکن کی جناب میں کوئی معروضہ بھیجا نہ اپنی سفارش کا کسی کو ذریعہ بنایا۔ بغیر کسی تحریک اور عرضداشت کے وہ اعلیٰ حضرت خرو دکن کے یوں مورد الطاف شاہانہ ہوئے کہ یکایک نصر شاہی کنگ کوٹھی مبارک سے صدر اعظم باب حکومت کے نام فرمان عطا وقت نشان صادر ہوا کہ ”ایک شخص جن کا نام بے نظیر شاہ ہے اور جو متوسل ہیں ان کو اس ماہ سے تیس روپیہ ماہوار تاحیات ایصال ہو؟“

شرح دستخط

پنجشنبہ ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ

ابھی چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ تیس روپیہ ماہوار میں مزید بیس روپیہ کا اضافہ جاری کرنے اور مع بقایہ یکمشت آدا

کرنے کا حکم ہوا۔ اس نوازش شاہانہ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اظہارِ تشکر کے طور پر شاہ صاحب خود حیدر آباد آتے اور اس مناسبت سے بارگاہِ خسروی میں کوئی قصیدہ گزرا نیتے مگر وہ سیکڑوں میل دور اپنی جگہ اپنے اس شعر کی تصویر بنے بیٹھتے تھے۔

فقر اپنی کمیل میں بیٹھا ہے مست

پیا پے چڑھاتا ہے حام المست

غالباً منشاءِ خسروی یہ تھا کہ شاہ صاحب حیدر آباد آئیں تو انھیں شرف باریابی عطا کیا جائے لیکن شاہ صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے ٹس نہیں ہوتے تو پیہم و دوسال گزرنے کے بعد ذریعہ فرمان مبارک مورخہ ۱۲ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۲۱ھ شاہ صاحب کو یہ اطلاع دینے کا حکم فرمایا کہ اگر وہ ایک ہفتہ کے عرصہ میں حیدر آباد نہ آئیں گے تو ان کا وظیفہ بند ہو جائے گا۔ جب الحکم شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے بتوسط ناظم صاحب امور مذہبی بارگاہِ خسروی میں ایک عریضہ ذریعہ ڈاک گزرا نا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

ان کا وظیفہ بمطابق و سوالِ بندگانِ عالی نے خود ہی جاری فرمایا جس کی سپاس گزاری حتیٰ الکویت نہایت فخر کے ساتھ فقیر دعا گو نے ادا کی لیکن اب مخلصانہ دعا گوئی پر ایک مشکوک دھبہ غرض کا پیدا ہو گیا یعنی حیدر آباد کی حاضری پر ازل سے وظیفہ منحصر ہے۔ الحمد للہ کہ حضور پُر نور نے وظیفہ سدود فرما کر اس دھبہ کو دور فرمایا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ علالت، پیرا سالوں اور دیگر خانگی امور کی مجبور لیں کی وجہ فی الحال وہ حیدر آباد نہیں آ سکتے۔ جب ان موانع کو خدا آسان فرمائے گا تو حاضری میں کب عذر ہو سکتا ہے۔

شاہ صاحب کا یہ جواب طبع ہمالیہ پر گراں گزرا۔ فوراً وظیفہ بند کر دینے اور شاہ صاحب کو اس کی اطلاع دینے کا حکم فرمایا۔ شاہ صاحب تو متوکل

تھے ہی اس کا کوئی اثر نہ لیا اور نہ اپنے استغناء میں کوئی فرق آنے دیا۔
اس پر کامل سات ماہ گزر گئے بشاہ صاحب کی بے نیازی یہ رنگ لائی
کہ شاہ حق آگاہ نے اس سے متاثر ہو کر مسدود شدہ وظیفہ پھر جاری
کر دیا۔ قصر شاہی سے فرمان جاری ہوا کہ :

”اگرچہ مرے حسب الحکم پچاس روپیہ حالی ماہوار بے نظیر شاہ جو
ایصال ہوا کرتی تھی وہ مسدود ہے لیکن بعد غور و فکر و حکم دیتا ہوں
کہ ماہور مذکور جس تاریخ سے مسدود ہے وہ ان کو ایصال کر دی جائے
ان کے پتہ سے اور آئندہ بھی اس پتہ سے ہر ماہ ایصال ہوا کرے۔
بے نظیر شاہ وارثی۔ بک ڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
شرح دستخط۔

۲۵ ذی الحجۃ الحرام ۱۳۲۱ ۵۱۳ ہجری
وظیفہ تو تاحیات تھا لیکن شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کی
صاحبزادی سیدہ فاطمہ محمود کی درخواست پر وظیفہ کا ایک ثلث ان کے نام
بھی جاری ہو گیا۔ صفی اور نگ آبادی کا یہ شعر سارے واقعہ کی عملی تفسیر
ہے :

اب جو بے مانگے کے مل جائے مقدر اپنا
ہم نقطہ حوصلہ اہل کرم دیکھتے ہیں

والاشان شہزادہ نواب معظم جاہادریع کے دو شعر

شہزادہ! میرے دوست سعید یار خان عرف "نواب" نواب
جنگ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور نواب منظور جنگ
دوام رکھتے۔ افسوس صد افسوس اچانک حرکت قلب بند ہو جانے
مارچ ۱۹۷۶ء کو انتقال کر گئے۔ نواب شاعر تو نہیں تھے مگر
ماہب ذوق اور دلدادہ شعر و شاعری تھے بلا کا حافظہ یا یا
کی غزلیں اور نظمیں ایسی روانی سے بحریت سناتے جیسے یہ ان
ہے اور ان کے انداز بیان کی خوبی اور طرز ادا کی دلکشی سے
بکھر جاتا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد تباہی کا شکار ہوئے لیکن
انھیں شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر کے شبانہ دربار سے
دیا دو سو روپیہ مشاہرہ مصاحبت کا ملا تھا۔ صبح دسام سوٹر
اور گھر چھوڑنے مقرر تھے ان کی دل بستگی اور ہر قسم کے ذوق
شہزادہ کے دربار میں موجود و میسر تھا۔ مجھ سے ملنے گھر آتے
شہزادہ شجاع کی غزلیں سناتے اور دربار کی دلچسپ باتیں بیان
ان کو شجاع کا اتنا کلام یاد تھا کہ اگر میں انھیں ماقط کلام شجاع کہوں
کمال تو یہ تھا کہ نواب معظم جاہ بہادر کے شعر سننے کے انداز
ہاں گفتگو اور بول چال کی ہویہ ہو بڑی مہارت سے نقل لاتے
طف کی بات یہ کہ نواب معظم جاہ بہادر کی زبان کی وہ ایک ذرا
بھی شاعری گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا کہ ہم دربار میں شہزادہ کے
بٹھے ہیں۔

دفعہ کہتے تھے نواب معظم جاہ نے فرمایا کہ غفران مکان نواب

میر محبوب علی خان کی پہلی جواں سال چھٹی صاحبزادی نظام النساء بیگم کا انتقال ہو گیا تو غفران مکان کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ اتنے متاثر ہوئے کہ آٹھ دن تک نہ کھایا نہ پیا اور کپڑے بھی نہیں بدلے حالانکہ وہ اتنے نفاست پسند تھے کہ دن میں تین وقت کپڑے بدلتے تھے۔ آخر کار پی ایک غزل کے مقطع میں انھیں کہنا پڑا:

روئے پیٹے بہت مگر آصف

مرنے والے کے ساتھ مرنے گئے

شہزادہ شجاع بڑی شان تمکنت سے فرمانے لگے میں نے بھی اس زمین میں غزل بھی ہے۔ حضرت غفران مکان کا مقطع پیش نظر رکھ کر مرے مطلع کو دیکھو تو بڑا لطیف دے گا۔

دے کے دل جان سے گزر نہ گئے

موت مسکن تھی پھر بھی مرنے گئے

۲: نواب معظم جاہ بہادر نے ایک دن استاد داغ کا یہ شعر سنایا:

رہ در راہ نصبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چہار بڑے سخت مقام آتے ہیں

پھر فرمانے لگے۔ اب میرا شعر سنو۔ اگر استاد داغ آج زندہ ہوتے تو میرے شعر کی داد دیتے:

اور شدت سے مرادوق طلب بڑھتا ہے

جب رہ شوق میں دشوار مقام آتے ہیں

ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے کلام پر اصلاح

ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ اور ان کے کلام پر علامہ اقبال کی اصلاح کے بارے میں ان کے ہمیشہ زادے آعظم راہی صاحب کا مضمون اخبار سیاست مورخہ ۲- جون ۸۹ء پڑھنے کو بلا کہیں دیکھا نہ سنا کہ علامہ اقبال نے کسی کے کلام پر باقاعدہ اصلاح دی ہے۔ اگر ڈاکٹر لمعہ کے کلام پر اقبال نے اصلاح دی ہے تو یہ بڑی بات ہے بڑا اعزاز ہے۔ جناب آعظم راہی صاحب شاید نہ جانتے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر لمعہ نے علامہ عبداللہ عبادی صاحب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ میرے ایک نیرنگ دوست جو علامہ عبادی کے ایک ارادت مند شاگرد ہیں بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر لمعہ، علامہ عبادی کے مکان آیا کرتے تھے اور بعد میں بہت مخلصانہ روابط آپس میں ہو گئے۔ تعارف اور ملاقات کی تبدیلیوں ہوئی کہ جب ڈاکٹر لمعہ نے ایک مثنوی ”مشرق نامہ“ بنی ان فارسی کبھی تو سب سے پہلے مولانا مناظر احسن گیلانی کی خدمت میں لغوی اصلاح پیش کی، مولانا بڑے عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے لیکن اصلاح سخن کافی اور ہی ہے، مولانا نے انھیں اپنے ساتھ علامہ عبداللہ عبادی صاحب کے گھر لایا اور توازن کے بعد مشرق نامہ پر اصلاح کی خواہش کی، علامہ عبادی نے شرف قبولیت بخشا اور مثنوی رکھ لی، بعد میں مشرق نامہ پر اصلاح فرما کر ایک خط کے ساتھ ڈاکٹر لمعہ کے پاس بھیجوا دی۔

خط حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخدومی۔ تسلیم بعد تکریم
الحمد للہ کہ آج پنجشنبہ ۲۔ ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ م ۶ اسفندار
ماہ ۱۳۵۵ کو مشرق نامہ کے اشراق نے واسع سخن کی تکمیل کردی۔ اس تفسیر
میں جا بجا معنوی تقصیر کا گمان ممکن ہے۔ شاید اس لیے کہ زبان ہی تکبیری
رسائی تھی۔ آپ کا معنی آفریں قلب روشن میری دسترس سے بلند تر تھا۔ تاخیر
کا عذر گناہ عجب نہیں بدتر از گناہ ہو۔

بود کہ یار شیر سگند ز خلق کریم۔ کہ از سوال تو سیم واز جواب نخل
آپ نے مقدمہ کے لیے حکم دیا ہے۔ اس لیے جلد سے جلد ایک نظم حاضر ہو جا
گی انشاء اللہ۔ یہ جرات محض اس بناء پر ہو سکتی ہے کہ بحر زخار میں لب ساحل
پرخص و خاشاک بھی ہوا کرتے ہیں کسی عجب کو نہ کہے کہ آپ یہ کتاب مجھ سے لے
لیں۔ اگر چہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ آپ قدم رنجہ فرماتے اور سوا جہ میں وجہ تفسیر
پیش کئے جاتے۔

والسلام بالاکرام

۱۶۔ محرم ۱۳۶۱ھ فادم عادی

مشرق نامہ علامہ عادی نے اصلاح دی مگر ان کی بلند حوصلگی اور اعلیٰ
ظہری دیکھتے کہ خط میں انہوں نے "اصلاح" کی بجائے "وجہ تغیر کے الفاظ
تجزیہ فرمائے۔ بعد میں علامہ عادی نے نشری بجائے نظم میں مقدمہ لکھ کر ڈاکٹر
لحقہ کو روانہ کیا جس کا ذکر متذکرہ خط میں ہے۔ اس نظم کے تیسرا شعر ہے۔
علامہ عادی عربی، فارسی اور اردو کے بے مثل صاحب طرز ادیب، نقاد
اور شاعر تھے ان کے فضل و کمال کا کیا کہنا۔ نظم پڑھتے جاتے تو محسوس ہوتا
ہے کہ علامہ عادی کے پردے میں اقبال بول رہے ہیں بشوی کے اشعار
علامہ عادی کے شاعر نے بدیہہ میں عنایت فرماتے ہیں۔ ہم بھی اس یادگار
غیر مطبوعہ شوی کو تبرکاً پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

بسم الله الرحمن الرحيم
مقدمه مشرق نامه

که اشراق طبع و کتور محمد عباس علی خان است از فقیر حقیر عبد الله السامدی -

۱۲ - محرم - ۱۳۶۱

آفرین بر لمعه نور ازل
ماه در جیب آفتاب اندر بغل
لمعه الوار عباس علی
حیدر آباد از فراغش منجلی
مشرق از الوار درخشنده یار
آفتابش بر دکن تابنده یار
نامه مشرق با اسلوب نوی
لا سمع از نور حکیم غزنوی
در جناب معرفت تا بار یافت
راستحه از نفحه عطّار یافت
صدق عشق داشت بران قوی
سینه اش پیر شد روح مولوی
دامن اقبال بگرفت از صفا
تار ساه در حریم مصطفی
فیضاب از دولت جاوید شد
فلک راه خواه توحید شد
طایر فکرش به پرواز عید
اوج گیر از بام آیات هدی
درد نواشان راه حقیق صاف داد
آهنگی از سیر استخلاف داد

سر استخلاص تمکین حق است
 ار تقائے دولت و دین حق است
 شیر مردے دام و ددر را خوار گیر
 سلسله از حیدر کرار گیر
 ملک مومن صراط مستقیم
 شیوه اش اعلائے قرآن حکیم
 سر بلندی را اسیر دون مخواه
 حکم قرآن بسته قانون مخواه
 از برائے کشور قلب سلیم
 نیست قرآن غمیر قرآن حکیم
 مومنان محروم از اسباب خیر
 تا بود قرآن حق محکوم غیر
 خیز تا قانون عباد راه یار
 مصحف تو حیدر شاهنشاه یار
 سپهر تو حیدر دل تا بجای
 امر حق محکوم باطل تا بجای
 گیتی از بهر مسلمان ساختند
 بسته زنجیر متان ساختند
 محرومان بارگه ذوالجلال
 دایه گر باشند محکوم ضلال
 سرنگون کن پرچم بیداد را
 بر شکن ایوان استبداد را
 باز گیر از دست دیوان باز گیر
 خاصه اسلام و دینیم و سریر

حضرت اسلام بے تمکین چرا است
 جلے سلم در صف یابین چرا است
 نور تو از شمع یزدان است و بس
 صد مسند از مسلمان است و بس
 باز روشن کن چراغ از نور بدر
 سفگان راتا براندازی ز صدر
 ذره سان در بند بیتابی سباش
 ہیمو ز گس در گران خوابی سباش
 خیز و تخت از دست دیوان باز جو
 باز جو ملک سلیمان باز جو
 تیغ و کف و ایت قرآن بہ پیش
 تا مسلمان باز یابد جائے خویش
 حامل تعلیم ملتہ این بود !
 مبلوہ اش بہر فروغ دین بود
 ملت از روح جہالتش زندہ یار
 سطوت تو حیدر از او پائیدہ یار

خط کی نقل ہمارے ہاں محفوظ ہے البتہ اصلاح شدہ ثنوی کی
 نقل ہمارے پاس نہیں۔ جناب اعظم راہی صاحب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر ملتہ
 کا سارا علمی ادبی سرمایہ ان کے ہاتھ میں ہے اگر اس لا قیمت ذخیرہ میں تلاش
 کریں تو یہ سب نایاب نوشتے مل جائیں گے۔ اگر ملتہ کے کلام پر اقبال کی کچھ
 اصلاحیں بھی برآمد ہو جائیں تو ان کا ادعا پایہ ثبوت کو پہنچ جائے گا۔

یاس یگانہ چنگیزی کی ملازمت و ترقی

واقعہ یہ ہے کہ سالی ریاست حیدر آباد میں خود حیدر آبادیوں کو ملازمت کے لیے دو صداقت ناموں کا حکومت کی جانب سے لزوم تھا۔ ایک صداقت ملکی دوسرے میٹرک یا مائل میاٹرک کا میاب سرٹیفکیٹ۔ لیکن بیرونی شعراء یا ادیب حیدر آباد آتے اور ملازمت کے خواہاں ہوتے تو قواعد ملازمت کو بالائے طاق رکھ کر آنے والے ہماں کی ایسی فراخ دلی سے پذیرائی ہوتی کہ متذکرہ لازم و ملزوم صداقت ناموں سے ان کو مستثنیٰ کر کے کسی عہدہ پر تقرر کیا جاتا یا اگر ابتداء میں کوئی عہدہ نہ بھی ملے تو بہت جلد دیکھتے کے دیکھتے وہ عہدہ دار بن بیٹھتے۔

سخن گسترانہ بات یہ عرض کرنا ہے کہ ایک کتاب "حیدر آباد میں بیرونی شعراء" حیدر آباد میں سنہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک گراں قدر مضمون پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرست صاحب (شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) کا بعنوان "یگانہ چنگیزی اور حیدر آباد نظر انداز ہوا۔" جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں جناب نورا الحسن صاحب کا حوالہ دیا ہے۔ نورا الحسن صاحب لکھتے ہیں "بشیر یا جنگ جواں زمانے میں انیسویں جرنل رجسٹریشن اور اسٹامپ تھے یا اس کو سب رجسٹری کی خدمت پر مامور کر دیا اور مرہٹوارہ میں ایسے مقام پر منتقل کر دیا جہاں کافی آمدنی تھی" (صفحہ ۱۵۷) جناب ڈاکٹر صاحب نے جناب سید اعظم دین اعظم کا بھی حوالہ دیا ہے جو رسالہ نقوش کے شخصیات نمبر سے ماخوذ ہے۔ ان کی تحریر کا ایک جملہ یہ ہے "انھوں نے کوئی ترقی نہیں کی اور فقط سب رجسٹرار کے چھوٹے سے عہدے پر رہ گئے" (صفحہ ۱۶۲) متذکرہ حوالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جناب میریاور علی خنجر کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے اپنے

استاد صفی اور نگ آبادی کو عثمان آباد سے لکھا تھا :

”مرزا واجد حسین یا اس عظیم آبادی لکھنؤی مصنف ”چراغ سخن“ چار یا پنج روز ہوئے یہاں آئے ہوئے ہیں بہت فلاکت میں ہیں مگر بڑے تعلی پسند اپنے آپ کو شاعر بے نظیر سمجھتے ہیں۔ شاعر احمد صاحب مزاج اول تعلقہ اور رانچور کی سفارش پر مرزا بشیر بیگ صاحب ناظم رجسٹریشن نے محکمہ رجسٹری عثمان آباد میں فی الحال نقل نویسی کر دیا ہے۔ غالباً یہاں ان کو ۲۵ - ۳۰ یل جائیں گے۔ آج کل وہ لیگانہ لکھنؤی تخلص کر رہے ہیں۔ مجھ سے ان سے ملاقات ہوگئی ہے۔ اکثر شعر و سخن کے تذکرے رہا کرتے ہیں“ اس خط پر تاریخ و سنہ ۱۸ فروری ۱۳۳۷ ف (۲۰ فروری ۱۹۲۸ء) درج ہے۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ ”لیگانہ کاسب رجسٹرار کی حیثیت سے عثمان آباد پر سنہ ۱۹۲۸ء میں تقرر ہوا۔“ (۱۵۷)۔ چنانچہ جناب خنجر کے خط کی تاریخ کی تصدیق مستزکرہ بیان سے ہو جاتی ہے نیز سنہ ۱۹۲۸ء کا تعلق اس خط سے بھی ہوتا ہے جو لیگانہ نے دوار کا داس شعلہ کے نام دیا جولائی کو لکھا۔ ۲۰ فروری سنہ ۱۹۲۸ء جناب لیگانہ رجسٹریشن آفس عثمان آباد میں نقل نویسی تھے لیکن پانچ مہینے نہیں گزرے کہ بحیثیت ب رجسٹرار لاہور تعلقہ ترقی ہوئی، کتنوں کے حقوق یا مال ہوئے ہوں گے کہ جو نیر سینیر کا خیال کئے بغیر نقل نویسی سے ب رجسٹرار ہو گئے! کیا اسے ترقی نہیں کہتے؟ سب رجسٹرار ”صاحب تعلقہ“ اور اپنے آفس کا سربراہ ہوتا تھا۔ بات یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن صفی اور نگ آبادی نے اپنے شاگرد خنجر کے خط کے جواب میں جو لکھا اس کے دو ایک جملے سنانے کو جی چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں ”..... دروغ کو فروغ کبھی نہیں ہوتا اور نقل نویسی را عقل نہ باشد آج ۲۵ - ۳۰ ہیں کل آپ سنہ تکتے رہ جائیں گے کوئی ہفتہ غیب سے دستگیری کرے گا۔ یہ ظاہری اسباب ہاتھی کے دانت ہیں“ جناب صفی کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ خنجر سنہ تکتے رہ گئے۔ اور لیگانہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت کو بھی ماننا پڑتا ہے دریاں چہ شک
بدنام کیا صفتی کو مئے خواری نے
یہ عیب نہ ہوتا تو ولی ہو جاتے
یہ دونوں خط ادبیات اردو میں محفوظ ہیں۔

شاعری جو ہر خرد ادا د

جب
اخبار سیاست مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۹۱ء میں جناب مولوی جلال الدین
کامیاب کا مراسلہ بعنوان صدر "آپ کا کالم" کی زینت ہے۔ مولوی کامیاب
نے جو دل چسپ واقعہ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ داغ کو جب معلوم
ہوا کہ ان کے بھتیجے نے شاعری شروع کر دی ہے اور آتش تخلص رکھا
ہے تو ان کو بہت تعجب ہوا۔ جب بھتیجے صاحب ملنے آئے تو داغ
نے ان سے اس بارے میں پوچھا۔ جواب اثبات میں ملا تو داغ نے ایک
مصرعہ
اُڑ گئی سونے کی چڑیا ہاتھ میں پیرہ گئی
دے کر طنز آگیا کہ اس مصرعہ پر گرہ لگنا نے نہیں ایک سال کی مدت دیتا ہوں۔
بھتیجے نے یہ کہہ کر کہ چچا صاحب کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
فوراً ہی دو سرا مصرعہ سنا دیا:

دامن یوسف جو پکڑا پیر زے بن کر رہ گئے

پہلی بات تو یہ کہنی ہے کہ استاد داغ کے تمام سوانح نگاروں نے لکھا
ہے کہ ان کے صرف ایک بھتیجے تھے جن کا نام مرزا امرا عواقل اور تخلص نادان
تھا۔ داغ کے شاگرد تھے اور حیدر آباد میں ان ہی کے مکان میں رہتے تھے۔
کچھ ایسے پڑھے لکھے تھے لیکن شاعری کے جوہر خداداد سے کما حقہ بہرہ مند تھے ان کی ہر یہ گوی
کے کئی واقعات لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ حیدر آبادی میں ان کا انتقال ہوا۔

دوسری بات یہ کہ جناب مولوی کامیاب کے تذکرہ بیان کردہ

واقعہ سے ملتا جلتا بدیہہ گوئی کا ذکر جناب نریش کمار شاد نے رسالہ بیسویں صدی کے افسانہ نمبر ۱۹۶۱ء میں بعنوان سُرخ ماشیے کیا ہے۔ جناب شاد لکھتے ہیں ”الوزحٰنین آرزو لکھنوی ابھی چودہ برس کے تھے جب اُن کے محلہ کے ایک بزرگ نے ان سے ازراہ مذاق کہا۔ میاں منجوا! سُنا ہے تم شعر بھی کہتے تھے ہو اگر اس مصرعہ کا دوسرا مصرعہ ایک سال میں بھی کہہ دو تو تمہیں شاعر مان لوں۔ مصرعہ یہ ہے :

اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

آرزو نے موزب ہو کر جواب دیا قبلہ! زندگی کا کیا بھروسہ سال بھر کی قید بھی کیوں ؟ لیجئے آپ کی فرمائش میں ابھی پوری کئے دیتا ہوں اور کچھ محلوں کے قائل کے بعد آرزو صاحب کہتے تھے لیجئے حضرت مطلع ہو گیا :

دامن اس یوسف کا آیا پُر زے ہو کر ہاتھ میں

اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

۲۔ جب بات چل نکلی ہے استفادہ کی خاطر یہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یکم اپریل ۱۹۹۱ء کے ”سیاست“ میں جناب مولوی کمال صاحب کا ایک مراسلہ بعنوان ”بدیہہ گوئی کا مقابلہ“ شائع ہوا تھا مولوی صاحب نے جو کچھ فرمایا حاصل کلام یہ کہ ایک دفعہ شاہ ظفر نے استاد ذوق سے چلمن پر شعر کہنے کی فرمائش کی تو ذوق نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ سنایا :

چن ترے دالال کی نازک بہت ہے اے صنم

کیا لگائی اس میں ہیں پلے سگس کی ٹیلیاں

شعر کہنے کے بعد ذوق نے غالب سے خواہش کی کہ وہ بھی چلمن پر شعر کہیں ظفر کا اشارہ پا کر غالب نے اس وقت تین شعر کہہ ڈالے اور ذوق کے شعر کے جواب میں طعنہ زن ہوئے :

یہ تو وہ چلمن ہے جس چلمن کی خاطر ہے درینے

باندھنے گر بندھ سکیں

جواب کا تل نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ”ذوق پر غالب کا البینا طعنہ اس دلی کدورت کو ظاہر کرتا ہے جو ہم عصر حاسدون میں ہوا کرتی ہے۔“

جواب کا تل صاحب نے ذوق اور غالب جیسے پہلوانانِ سخن کی بدبینہ گوئی کے مقابلہ کا جو واقعہ لکھا ہے وہ تعجب خیز اور قابلِ غور ہے کیوں کہ ذوق اور غالب کے تذکرہ نویسوں نے کہیں اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں کیا ہے البتہ رسالہ نقوش لاہور کے ”ادبی معرکہ نمبر“ جلد دوم میں جناب ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی نے ذوق اور شاہ نصیر کے معرکے کے عنوان سے چند ادبی معرکوں کا حال لکھا ہے مولوی کامل صاحب نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ مذکورہ مضمون میں موجود ہے لیکن واقعہ کی نوعیت اور اشعار کے الفاظ اور ان کی نشست میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے اور پھر خاص بات یہ کہ اس معرکہ کا تعلق غالب سے ذرا بھی نہیں بلکہ شاہ نصیر کے شاگرد منشی گھنٹاشام داس عاصی نے ایک مشاعرہ میں وہ شعر کہے تھے۔ اس طرح غالب جیسے فراخ دل شاعر پر حاسدانہ دلی کدورت کا الزام خود بخود مسترد ہو جاتا ہے۔ آخر میں ہم مولوی کامل صاحب سے معروضہ کرتے ہیں کہ اپنے بیان کردہ واقعات کے مستند مآخذ کی نشاندہی فرما کر شکوک دور فرمائی تاکہ جن جن اصحاب نے واقعہ بیان کرنے میں غلطیاں کیں ہیں ان کی اصلاح اور درستی ہو جائے۔

”شعراے اردو کی حاضر جوابی“

اخبار سیاست مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۹۱ء بعنوان صدر مراسلہ شائع ہوا ہے مراسلہ نگار جناب شمیم نصرتی صاحب آرکیٹیکٹ بیان کرتے ہیں کہ حضرت توفیق حیدر آبادی مصرعہ ثانی ”کھیل کے دن میں لو کین ایسے صیاد“

سے لیے موزوق مصرعہ اولیٰ کی تلاش میں تھے۔ ان کے شاگرد جناب کنور حیدر آبادی نے سنا تو فی البدیہہ یہ مصرعہ کہہ دیا۔

پیرنہ کا ٹا پیسہ توڑا بلبل ناشاد کا!

جناب رفیق مارہروی نے اپنی کتاب ”ہزم داغ“ میں کئی واقعات اس نا آغ کی زبانی سن کر لکھے ہیں۔ داغ نے بیان کیا کہ:

”..... یہ بچہ کنور سنگھ ہی کا تھا اسے جو شرارت سوچھی جھٹ ایک کرسی پر چڑھ کر نہایت صفائی سے ایک بلبل کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور بلبل کو باہر نکال کر ایک ڈور سے اس کا پاؤں باندھ لیا اور لگے صاحبزادے ہو میں اڑانے۔ کنور صاحب صاحبزادے کی اس حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ بڑے پیر گو شاعر تھے مجھے مخاطب کر کے بولے:

پیر کے بدلے پاؤں باندھا بلبل ناشاد کا

میں نے مصرعہ سنا۔ فوراً دوسرا مصرعہ ذہن میں آگیا اور کنور صاحب سے کہا کہ لیجئے آپ کا پورا شعر ہو گیا:

کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا!

میں نے جناب نصرتی صاحب کے واقعہ کا ماخذ کیا ہے۔ اگر وہ خود اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں یا کسی مستند معتمد راوی سے سنا ہے پھر بدیہہ گوئی کے ان دونوں واقعات کے مصرعوں میں الفاظ کی مماثلت اور خیال کی یکسانی دُنیا سے ادب میں توارد کی بڑی دلچسپ مثال ہے۔

”حضرت عشق اور ان کے تذکرہ نویس“

میلاد شریف کی محفلوں، قصیدہ بردہ کی مجلسوں اور ایسے ہی مواقع پر حضرت عشق رحمۃ اللہ علیہ کا عربی سلام بہ بارگاہ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم نہایت دلہانہ انداز سے پڑھا جاتا ہے اور حاضرین بڑی عقیدت

علوم و فنون سے رغبت رہی۔ ابتدائی عربی و فارسی تعلیم حسب ضرورت اپنے والد منشی محمد حسین صاحب سے حاصل کی اور پھر مشہور پیر طریقت حضرت سید افتخار علی شاہ صاحب وطن رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ حضرت عشق نے اس دیباچہ میں اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو فارسی دیوان کا ذکر کرتے ہوئے اپنے واردات قلبی کا جذب و کیف اور رویائے صادقہ کو پُر اثر انداز میں لکھا ہے۔

حضرت عشق نے بلدہ حیدرآباد میں عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا اور یہیں آخری سال سلی۔ لواب سالار جنگ اول (لواب میر تراب علی خان) کی والدہ ماجدہ کی سرکار میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی مورثی جائیداد پر بحیثیت نائب جاگیر کام انجام دیے کر وظیفہ پر سبک دوش ہوئے چنانچہ اپنے دیوان ”محامد محمدی“ کی طاعت کے بعد ایک نسخہ پر بقلم خود حسب ذیل تحریر لکھ کر لواب سالار جنگ (لواب یوسف علی خاں) کی خدمت میں پیش کی :

ہو اللہ العزیز

دیوان اول نعتیہ عشق موسوم بہ محامد محمدی الموصوف بہ توصیفات مصطفوی بشرط ملاحظہ سرکار فیض آثار عالیجناب لواب سالار جنگ بہادر دام اتیالہ صدر المہام سرکار عالی طبع زاد و گذرا یندہ غلام مصطفیٰ تخلص عشق نمکخوار قدیمی نائب جولور جاگیر۔

مصرعہ

گر قبول افتد زہی غر و شرف

رباعی طبع زاد عشق

سالار جوان بخت یہ سالار رہے یہ سر پہ مرے بس سایہ سرکار دل بہت ہے اس در کے سوا جاتیں کہاں اب عشق نہ مدت سے اس در کے نمکخوار رہے (شرح و تخط) غلام مصطفیٰ عشق غفر اللہ (کتاب فاسالار جنگ نمبر کتاب ۳۹۲)

حضرت عشق حیدر آباد کے شاعروں میں شرکت بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت شمس الدین محمد فیضؒ کے عرس کے موقع پر مزار حضرت فیضؒ واقع لال دروازہ میں طرحی مشاعرہ میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ناری وارد و طرح میں اپنا کلام سناتے تھے۔ اس قدیم یادگار مشاعرہ میں جن شعراء کا کلام پڑھا جاتا یا جو غزلیں ذریعہ ٹیپ وصول ہوتی ہیں ان کا مجموعہ ”گلدستہ فیض“ کے نام سے بانی مشاعرہ حضرت نواب مشرت جنگ فیاض شائع فرماتے تھے۔ ان گلدستوں میں حضرت عشق کا طرحی فارسی وارد و کلام موجود ہے۔ ”گلدستہ فیض“ دیکھنے سے یہ واضح ہے کہ حضرت عشق فارسی وارد و طرحی مہرغ پر دو غزلیں کہتے تھے ایک عشقیہ اور ایک نعتیہ۔ اردو طرح پر چند شعر حسب ذیل ہیں :

طرح : مزار فیضؒ پر اللہ کی رحمت بستی ہے [۵۱۳۲۵]

ع : شراب عشق سے ہوں مست فکھو جوش مستی ہے

سرا مذہب ہے زندگی کا میرائے پرستی ہے

ن : شراب عشق احمد سے یہ حاصل مجھ کو مستی ہے

خبر یہ بھی نہیں کیا ہے عدم کیا چیز، مستی ہے

طرح : فصل گل آئی گھٹا چھائی ہے ۵۱۳۲۶

ع : لب پہ ابہ بھر میں جان آئی ہے : شردہ وصل قضا لائی ہے

ن : باغ طیبہ سے صبا آئی ہے : بوئے گل وصل علی لائی ہے

طرح : اس کا سایہ جو گرے یوسف ثانی ہو جائے ۵۱۳۲۷

ع : یار نازک ہے طبیعت ہی ہے نازک اسکی

ہو سک بات تو بس دل پہ گرانی ہو جائے

ن : رُتبیہ ہوتا ہے بقا کا اسے حاصل عشق

عشق محبوب الہی میں جو فانی ہو جائے

طرح : سیر جو ساحتِ دل میں ہے گلستان میں نہیں۔ ۵۱۳۲۸

ع. بادشاہ سارے حسینوں کا ہے وہ یار حسین
حسں ایسا تو کسی حور میں غلامانی میں نہیں
ن. سب حسینوں سے ہیں محبوب خدا بڑھ کے حسین

حسں ایسا تو ملک میں نہیں انسان میں نہیں

حیدر آباد میں جناب محمد عبداللہ خان ضیفم مشاعرے منعقد کرتے تھے
حضرت عشقی ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مشاعرہ کے گلدستوں
میں عشقی کا کلام ملتا ہے چنانچہ غفران مکان لؤاب میر محبوب علی خان کی
بتسویں سالگرہ کی سرت میں منعقدہ مشاعرہ ”گلہ سستہ جشن اصفیہ“
(۱۳۱۵ھ) میں حضرت عشقی کی ”دور باعیاں اور غزل دعائیہ“ کے عنوان
سے بارہ شعر ملتے ہیں۔ چند شعر تبرگ پیش ہیں :

یہ سال بادشاہ کو مبارک خدا کرے ان کو حیات خضر و مسیحا عطا کرے
سائل کو احتیاج نہ ہو پھر سوال کا یوں کامیاب شاہ کا دست سخا کرے
مشہور ایسی ان کی عدالت جہاں میں ہو دلبر بھی بے دلول پہ نہ حور و حفا کرے
حاجت روائی کرتے ہیں جیسی یخلق کی ان کی خدا بھی ایسی ہی حاجت روا کرے
باغ دکن کی ان کو دکھائے خدا بہار یہ باغ و مہم یوں ہی بھیولا پھلا ہے
لکھے ہیں چند شعر یہ میں نے دعائیہ بہر نبی قبول خدا یہ دعا کرے

یہ بات بڑے حیرت کی ہے کہ جناب ضیفم کے مرتب کردہ ”تذکرہ شعراء
”یادگار ضیفم“ (۱۳۳۴ھ) میں جو یہ شکل مخطوط ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد
(نمبر ۵۶۴) میں محفوظ ہے اور جس میں شمالی ہند اور دکن کے تقریباً پانچ سو سے
زیادہ شعراء کا ذکر موجود ہے اس میں حضرت عشقی کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ جناب
ترک علی شاہ ترکی نے اپنے ”تذکرہ سخن وراں چشم دیدہ“ میں صرف دو جملے لکھتے
ہوئے ان کی فارسی غزل کے ساتھ شعر لکھے ہیں :

”عشقی تخلص غلام مصطفیٰ نام حیدر آبادی۔ روزی در مشاعرۂ فیض دیدہ
بودم۔ حال علم و سنین عمر یاد نماندہ۔ ابن شعر (فکر و ست)۔“ (ص ۹)

حضرت عشقی کے قریبی رشتہ دار اور دوست احباب ان کے وطن بیدر میں بستے تھے مگر اس وقت کسی نے بھی ان اصحاب سے عشقی کے حالات زندگی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ رشتہ دار تو پاکستان منتقل ہو گئے اور جو یہاں رہ گئے وہ ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس طرح اہل دکن کی بڑی بد قسمتی ہے کہ دکن کے مایہ ناز نعت گو شاعر کے حالات زندگی گمنامی کے پردے میں گم ہو گئے۔

ابھی ایک سال پہلے حضرت عشقی پر پہلا تحقیقاتی مضمون بہ عنوان ”منازلِ نعت حضرت ابوالوالا غلام مصطفیٰ عشقی بیدری۔ ایک نعارف“ بڑے اشتیاق و ذوق سے پڑھا جو جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب ریسرچ اسکالر اردو گلبرگہ یونیورسٹی نے ایک سیمینار میں پڑھا تھا جو بہت سراہا گیا اور جو بعد میں ان کی مصنفہ کتاب ”نقطہ نظر“ میں شائع ہوا۔ جب ہم نے یہ مضمون پڑھا تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب نے وہی سب حال و قال دھرا دیا جیسے حضرت عشقی نے ”محامد محمدی“ کے دیباچہ میں بیان کیا، حد تو یہ ہے کہ بغیر تفسیر الفاظ سارے جملے من دعویٰ حضرت عشقی کی تحریر کی پوری کاپی ہیں بسوائے تاریخ پیدائش ملازمت اور تاریخ وفات اور کچھ اضافہ نہیں ہے۔

اسی دوران سال ۱۹۹۰ء، ماہ فروری کے ماہ نامہ سب رس حیدرآباد میں جناب مولوی عبدالغفار خان ظفر صاحب کا ایک اور محققانہ مضمون ”ابوالوالا غلام مصطفیٰ عشقی اور ان کا نعتیہ کلام نظر افروز ہوا۔ صاحب موصوف کے مضمون کو ہم نے کئی بار بعد جذبہ شوق پڑھا۔ واقعی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عشقی پر یہ پہلا تفصیلی مضمون ہے جس سے عشقی کے بارے میں چند اہم اور کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کے بنبرگوں کا حال، ملازمت اور خاصی طور سے ان کی شادی، بیوی بچوں اور دامادوں کے متعلق بڑے دل چسپ معلومات فراہم کئے ہیں۔ غیر مطبوعہ کلام بھی لکھا ہے۔ فارسی اور اردو دیوان

میں مندرجہ قصیدے، غزلیات اور اشعار کی تعداد بھی بتائی ہے اتنے قیمتی اور معلومات آفرین تبصرے کے باوجود جو بات کھٹکتی ہے اور حیرت میں ڈالتی ہے وہ ہے جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب مولوی عبدالغفار خان ظفر صاحب کے مضامین میں تحریک یکسانیت اور مماثلت۔ اور پھر حیرت بالائے حیرت یہ کہ ہر دو مضامین کی تحریر کے الفاظ، سارے جملے اور حوالہ اشعار سوائے چند جزوی اختلاف ہو ہو دی ہیں جن کو حضرت عشق نے اپنے اردو دیوان ”محامد محمدی“ کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ دونوں مضامین اسی دیباچہ کے گرد گھومتے ہیں اور اسی کی آواز بازگشت معلوم ہوتے ہیں تحقیقی سبابت میں یہ تو ارد بھی خوب ہے! اور دلچسپ ہے! شامل کئی پیش کی جاسکتی ہیں بہ خوف طوالت صرف دو نمونے تحریر پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں :

[۱] ”نعت کا قصیدہ اور سلام عربی الحمد للہ قبول ہو گیا ہے کہ بعض حاجیوں نے بعالم رویا مجلس رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں یہ قصیدہ اور سلام عربی پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور سنا ہے اکثر مجالس میلاد شریف وغیرہ میں جب یہ قصیدہ اور سلام عربی پڑھا جاتا ہے تو حاضرین مجلس کی حالت جذب محبت اور جوش رقت سے بے خودی اور بے ہوشی کی ہوجاتی ہے“ [محامد محمدی ص ۱۲]

”حضرت عشق کے بعض قہائد و نعت اور سلام مقبول عام ہو چکے ہیں الحمد للہ مجالس میلاد شریف وغیرہ میں آپ کا سلام یا قصیدہ عربی پڑھا جاتا ہے تو حاضرین مجلس کی حالت سہل سی ہوجاتی ہے۔۔۔۔۔ حلیب محبت سے بے خودی اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔“

[نقط نظر ص ۲۹]

عالم رویا میں حضرت عشق کے قہائد، نعت اور سلام عربی الحمد للہ مقبول ہو گئے ہیں کہ بعض صاحبِ دل بزرگانِ دین نے عالم رویا میں

مجلس رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں قصائد اور عربی سلام پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور سنا ہے۔ یوں بھی اکثر میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب قصیدہ اور سلام پڑھا جاتا ہے تو حضار مجالس پر حالت جذب محبت جوش و ولولہ، رقت دے خودی بے ہوشی کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ [سب رس ص ۱۸]

[۲] ”بعیت کر کے منسلک حقیقت کا ساک اور اسرار معرفت کا مائل اور تصفیہ قلبی اور تزکیہ روحی کا شاغل ہوا اور محبوب ازلی کا راغب اور مطلوب حقیقی کا طالب بنا۔ جس سے درد محبت دل درد ناک کو اور دکھانے لگا اور شعلہ جان سوز جی کو اور ہلانے لگا۔ آخر جوش محبت سے جنون کی حالت ہوئی کہ حال درد دل بغیر زبان پر لانے کے چپن نہیں آتا تھا لہذا درد دل کا حال قصیدہ و غزل و اشعار میں لکھ کر پڑھتا اور داتا اور احباب کو سناتا تھا جس سے دل مخزون کچھ نسکین پاتا تھا اور روح حزیں کو بھی کچھ مزہ آتا تھا ایک واسوخت موسوم بہ طراز سخن جو طبع ہو چکا تھا باقی رہ گیا جس کے دو بند یہ ہیں :

گلشن حُسن کا یارب نہ کوئی خواہاں ہو اس کی گلگشت کا دل کو نہ کوئی ارمان ہو
سرد قامت پہ نہ قمری سا کوئی قریاں ہو یاد نگل رو میں نہ بلبل سا کوئی ناوان ہو
داغ تنہائی کا کھائے تو گوارا ہو دے

نیر کبھی لارہ و خون کا نہ نظارا ہو دے

چمن عشق کا کوئی بھی ہوا دار نہ ہو دل کبھی اس کے تماشے کا طلب گار نہ ہو
کسی کلرد کے تصور میں کوئی خوار نہ ہو نرگسی چشم سیاہ کا کوئی بیچار نہ ہو

جاں پر لاکھ ریاض اپنے اٹھائے کوئی
اس چمن سے بخدا دل نہ لگائے کوئی

[محمد محمدی ص ۱۵]

”عمر بھر تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب میں محور ہے اور آپ پر مغز کی

کیفیت طاری ہوئی۔ اس حالت میں آپ اپنے سوز و رونا اور کرب و ہردن کو اشعار میں ڈھاتے اور پڑھ کر رویا کرتے تھے جس سے آپ کے دل مخزون کو تسکین اور روح مضطرب کو چین نصیب ہوتا چنانچہ گلزار سخن میں ایک جگہ مضطربانہ فرماتے ہیں:

گلشنِ حسن کا یارب نہ کوئی خواہاں ہو اسکی گلگشت کا دل کو نہ کبھی ارمان ہو
چمنِ عشق کا کوئی بھی ہوا خواہ نہ ہو دل کبھی اس کے تماشے کا طلب نہ ہو
سرد قامت پہ نہ قمری سا کوئی قرباں ہو
یاد نگرو میں نہ بلبل سا کوئی نالان ہو

[نقطہ نظر ص ۲۸]

.... مسلک حقیقت کے سالک اور اسرار معرفت کے قائل
تصفیہ قلبی اور تزکیہ روحی کے شاعری محبوبِ اذلی سے راجب اور مطلوب
حقیقی کے طالب ہوئے جس سے دردِ محبت دل دردِ ناک کو دکھانے لگا
اور شعلہٴ عشق دلِ حیاں سوز کو جلائے لگا۔ آخرش جوشِ محبت سے جنون
کی حالت ہوئی اور آپ حالِ دل بربان شعر لکھتے، پڑھتے اور روتے
تھے جس سے آپ سے دل مخزون کو تسکین ملتی اور روح حزینِ طین ہوتی تھی۔
چنانچہ گلزارِ سخن میں مضطربانہ فرماتے ہیں:

گلشنِ حسن کا یارب نہ کوئی خواہاں ہو اسکی گلگشت کا دل کو نہ کبھی ارمان ہو
کسی مگرو کے تصور میں کوئی خوار نہ ہو رنگِ حشمِ سیاہ کا کوئی بیمار نہ ہو
جان پر لاکھ ریاہیں اپنے اٹھائے کوئی
اس چمن سے بخدا دل نہ لگائے کوئی

[سبکس ط ۱۷۱]

حضرت عشق کے واسوخت گلزارِ سخن سے چوراسی بند ہیں اور ہر بند پر نمبر درج ہے۔ ابتداء میں دو رباعیوں کے بعد واسوخت کا آغاز ان ہی دو بند سے ہوتا ہے (یعنی ایک و دو) جو حضرت عشق نے لکھے ہیں لیکن بڑا

تعجب ہے کہ حضرت عشقؒ نے جو بند محمدؐ محمدیؒ میں لکھے ہیں ان کی صحیح نقل بھی ان دونوں اصحاب نے نہیں کی۔ اصل سے نقل کرنے میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں ہے۔ نہ قافیہ و ردیف درست نہ ترتیب برابر!

چلیے ہم اس غلطی کو کتاب کے سر صفحہ پتے ہوئے فیصلہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں۔ ”گلزار سخن“ کو مولوی عبدالغفار خان صاحب نے عشقؒ کا دیوان ٹھہرایا ہے (ص ۲۲) لیکن حقیقت میں وہ دیوان نہیں واسوخت ہے جو سنہ ۱۳۰۳ھ [تیرہ سو تین ہجری] میں شائع ہوا۔ گلزار سخن کیا بے نایاب ہے خوش قسمتی سے ناچیز کے پاس ایک نسخہ دستیاب ہے۔ اس دستخط کے لوح کتاب پر حسب ذیل عبارت درج ہے:

طبع زاد بندہ چرخ خطا غلام مصطفیٰ تخلص عشقؒ متوطن محمد آباد عرف بید
حال ساکن حیدر آباد دکن۔ نایب علاقہ جناب بیگم صاحبہ قبلہ یعنی جدہ ماجدہ
عالی جناب مدارالمیام سرکار نظام خلد اللہ و دولہ الی یوم القیام شاگرد
جناب سید علی صاحب فکر لکھنوی مدظلہ العالی

منذکرہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عشقؒ فکر لکھنوی کے شاگرد تھے اور جب یہ واسوخت طبع ہوا تو ان کے استاد جناب فکر لکھنوی بقید حیات تھے۔

حضرت عشقؒ نے اپنے دیوان ہائے اردو و فارسی کے نام ”محمد محمدیؒ“ میں لکھ دیئے ہیں۔ جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان صاحب نے ایک دیوان کا نام ”گلزار مصطفویؒ“ بتایا ہے (نقطہ نظر ص ۲۵) اور سب رس ص ۲۲ حالانکہ عشقؒ نے اس کا نام ”گلستانہ مصطفویؒ“ لکھا ہے۔ [ص ۶]

مولوی عبدالغفار خان صاحب رقم طراز ہیں:

”حضرت عشقؒ کے وصال کے بعد یہ جملہ قلمی دوادین اعلیٰ حضرت شہر یار دکن حضور نظام آصف سابع کے شاہی خزانہ کتب میں داخل

کئے گئے جس کے عوض آپ کی زوجہ محترمہ کو تاحیات تیس روپے ماہوار جاری ہوئی؟ [صفحہ ۲]

مولوی عبدالغفار خان صاحب نے اپنے اس بیان کا کوئی حوالہ یا شہادت پیش نہیں فرمائی اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ حضرت عشق کے انتقال کے بعد ان کی دیوانی موجود تھیں محضوں نے حضرت عشق کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دیوان اعلیٰ حضرت حضور نظام کی خدمت اقدس میں پیش کئے تھے۔ حضور نظام نے اس کے عوض میں نہیں بلکہ بمرام خسروانہ ہر دو بیوہ کو تاحیات دس دس روپیہ ماہوار وظیفہ عطا کرنے کا فرمان نافذ فرمایا۔ قدرے تفصیل یہ ہے کہ جملہ سات مجموعہ کلام پیش ہوئے جو حسب ذیل ہیں :

(۱). محامد محمدی [مطبوعہ]

۲. رفیع مناجات //

۳. گلزار سخن //

۴. گلستانہ مصطفوی //

۵. دیوان جلد اول اردو [قلمی]

۶. دیوان جلد دوم اردو //

۷. دیوان فارسی //

جب اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ان کے کلام کے یہ مجموعے پیش کئے گئے تو منشاء حضور یہ ہوا کہ منجانب سرکار انہیک شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ محکمہ فینانس کو حکم فرمایا :

حکم :- [سات] کتابیں مولفہ غلام مصطفیٰ عشق مرحوم جو میرے پاس آئے ہیں حسب فہرست منسلکہ مرسل ہیں۔ مرحوم کا جس قدر اردو اور فارسی نعتیہ کلام ہے اس کو بعد اصلاح منجانب سرکار طبع کر دینا مناسب ہوگا تاکہ عام لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں اور مصنف کی بیواؤں کے نام بطور

گزارہ کچھ مقرر ہونا چاہیے لہذا بلا لپسی کتب اس بارے میں صدر الصدور کی رائے عرض کی جاتے۔

شرح دستخط۔

پنجشنبہ ۲ ربیع الاول شریف سنہ ۱۳۲۷ھ

اس وقت صدر الصدور کی کرسی پر حضرت جیب الرحمن خان شیرانی ازاد صدر یار جنگ ہائے نثر تھے۔ حسبِ تعمیل ارشاد سلطانی موصوف نے اپنی رائے پیش کی اور یہ بھی لکھا کہ ”نعتیہ کلام جو غیر مطبوعہ ہے اس کی اشاعت منجانب سرکار عالیہ باعث اجر و ثواب ہوگی۔ بیواؤں کے نام سائت سائت روپیہ مقرر فرمائیے جائیں تو عین مرحوم خسروانہ ہے؟“
صدر الصدور کی رائے ملاحظہ فرماتے کہ بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام

نے اس میں اضافہ کر کے حکم فرمایا:

حکم :- مرحوم کی ہر بیوہ کے نام عرصہ جمادی الاول سنہ جاریہ سے تاحیات دس روپیہ ماہوار جاری کی جائے۔ مرحوم کا مؤلف نعتیہ کلام جو غیر مطبوعہ ہے اس کی اشاعت منجانب سرکار پہلے ہونا مناسب ہے۔ تاکہ اس سے عوام کو فائدہ ہو۔ لہذا دریافت کیا جائے اس کام کے لیے کس قدر صرفہ ہوگا تاکہ اس پر غور ہو کر حکم مناسب صادر ہو۔ کتب واپس کئے جاتے ہیں۔ شرح دستخط

پنجشنبہ ۳ جمادی الاول ۱۳۳۷ھ

حب الحکم معتدا امور مذہبی نے بتوسط صدر اعظم طباعت دلیان کے اخراجات کا حساب حضور نظام کی خدمت اقدس میں پیش کیا یہ بات واضح ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام حضرت عشق کے نعتیہ کلام سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ منجانب سرکار جلد اس کی اشاعت ہو۔ ہر دو فرما ان اس حقیقت کے شاہدین۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عشق کے نعتیہ کلام کی اشاعت منجانب سرکار نہ ہو سکی۔ سرکاری ریکارڈ میں

طاعت کلام کی کوئی مثل باوجود تلاشِ بسیار نہ مل سکی۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ اگر حضرت عشقی کے نعتیہ کلام کی اشاعت منجانب سرکار ہوتی تو حیدرآباد کے کتاب خانوں میں اس کے نسخے ضرور مل جاتے۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز ریکارڈ قسط (۸۱) فہرست نمبر (۱) نشان سلسلہ ۱۲۸۰۔

حضرت عشقی کی تاریخ وفات جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان صاحب نے ہجری مادہ تاریخ ”ہندہ شریں سخن“ اور ”راغب گشت“ مادہ عیسوی لکھا ہے۔ تاریخ پیدائش بھی ہر دو اصحاب نے لکھی ہے لیکن تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا کوئی حوالہ یا شہادت فراہم نہ کر سکنے کی وجہ بیان مصلحت نہیں بلکہ مشتبہ ہے۔ تاریخ وفات نے تو عجیب شش و پنج میں ڈال دیا ہے۔ حضرات! حیرت کا یہ وہ مقام ہے جہاں تحقیق سر بہ گریباں اور ریسرچ لظریں نیچی کئے کھڑی ہے اور ہم خامہ انگشت پہ دنگ کر اسے کیا کہتے کی تصویر! غرہ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۷ھ (تیرہ سو ستیس ہجری) میں حضرت عشقی کی ہر دو بیواؤں کو ماہوار وظیفہ دینے کا فرمان صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ انتقال بھی اسی سنہ ۱۳۳۷ھ کو ہوا ہوگا اگر ہم جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان صاحب کی بیان کردہ تاریخ وفات سنہ ۱۳۴۱ھ [تیرہ سو اکتالیس ہجری] کو صحیح تسلیم کریں تو یہ وظیفہ ہوگی قبل از وفات شوہر کی ایک حیرت انگیز مثال ہوگی یعنی زوجین کو پہلے وظیفہ ہوا اور چار سال بعد شوہر کا انتقال!

دونوں مضمون نگاروں نے حضرت عشقی کا جائے مدفون احاطہ درگاہ حضرت اُجالے شاہ صاحب میں بتایا ہے لیکن ہمارے دوست شیخ عبدالرحمن صاحب لطیف صدیقی فرزند حضرت خواجہ عبدالعلی صدیقی صاحب (رحمہم اللہ) نے مضمون کی ابتداء میں کیا ہے) اپنے ہمراہ ہیں لے جا کر مزار حضرت عشقی کی نشاندہی کی۔ حضرت عشقی کا مزار درگاہ حضرت بخاری شاہ صاحب

(سعید آباد) کے باب الداخلہ کے روبرو ایک اُونچے چو ترہ پر ہے مزار پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ ہمارے پوچھنے پر جناب اٹھ صدیقی صاحب نے بتایا کہ اپنے والد محترم کے ساتھ وہ کئی بار بہر ناسخ یہاں مزار عشقی پر حاضر ہوئے ہیں۔ عاشقِ رسولؐ عشقی کا ایمان اور ایقان تو یہ ہے کہ غلامِ مصطفیٰؐ ہونے کی نسبت خالی نہ جائے گی۔

میں دیکھوں گا وہاں سے رات دن دیدارِ حضرت کا

درِ سیحہ باغِ جنت کا کھلے گا میری تربت میں

عرب و عجم کے کتنے محنت گو استادانِ سخن گزرے ہیں جن کی نعت تمام شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ایک بلند مقام پہنچی ہے لیکن دکن کے گننام شاعر حضرت عشقی کے عربی سلام کو جو ہم گیر مقبولیت اور شہرت دوام ملی وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی ان کا سلام دنیا کے گوشہ گوشہ میں جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں بڑے ذوق و شوق اور احترام سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ ایسی مقبولیت کیوں نہ نصیب ہو جب کہ یہ سلام مقبول بارگاہِ خیر الانام ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان ظفر صاحب کے مضامین علمی و ادبی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اصحاب نے یہ مضامین لکھ کر حضرت عشقی پر مزید کام و تحقیق کرنے والوں کے لیے راہیں کھول دی ہیں۔

تآباں ایک شاعر ایک انسان

دکن میں غزل کی آبرو اور ”زنجیر و زنار“ کے خالق جانشین الدین تآباں نے ۱۰۔ اپریل ۱۹۸۵ء قید ہستی سے رہائی پائی۔ شاعر کا فطری شوق لڑکپن سے رہا، شروع ہی سے صفتی اور ننگ آبادی جیسے بہہ دان استاد سخن کی شاگردی اور تقلید نے ان کی سخن گوئی کو ایسا نکھارا اور سنوارا کہ آخر کار مکتب صفتی کے ان شاگردوں میں گنے جانے لگے جو اس وقت استاد کی درجہ پر فائز ہیں۔ اگرچہ انہوں نے دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل کے لیے جن داخلی و خارجی لوازم احاطا اور جذبات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے لیے عطیہ قدرت تھے اس لیے وہ ایک کامیاب غزل گو کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔ انھیں اپنے استاد صفتی سے بڑا جذباتی لگاؤ تھا، بڑی والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت صفتی کے انتقال (سنہ ۱۹۵۲ء) کے بعد ہی بطور یادگار انجمن ”ادبستان دکن“ کی بناء ڈالی جس کے وہ معتمد رہے۔ اس انجمن کی قرار داد کی بناء پر تآباں کے ذخیو شعری سے ان کے فرزند رون رحیم حضرت صفتی کی دو سو غزلیات کا انتخاب کر کے ”گلزار صفتی“ کے نام سے مرتب و شائع کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

جناب تآباں کی علالت کا سلسلہ بڑا طویل رہا۔ بعض وقت بڑے نازک مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن طویل بیماری میں بھی کبھی چڑچڑاہٹ پیدا نہیں ہوا۔ ہمیشہ صابر و شکر گزار نظر آتے۔ درد اور تکلیف کو خوش طبعی اور شاعری کے پردے میں چھپاتے تھے۔ اللہ سے زیادہ لو لکائے رکھا اور ہر ملنے والے سے خاتمہ بالینہ کی دعا کے طالب ہوئے۔ انتقال سے چند دن پہلے دو اذان اسری ملنے لگی تو میں نے صحت یابی کی دعا کی فرمایا

خاتمہ بالخیر کی دعا کر د۔ ان کی خواہش کے احترام میں میں نے کبھی کا شعر سنایا:

دل سے دعا نکلتی ہے کیفی تیرے لیے
اللہ تیرا خاتمہ ایمان پر کرے
آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے اور بڑی حسرت سے اپنے استاد صقی کا شعر پڑھا:

آفت کشان عشق کے دل ٹوٹ جائیں گے
میرا آخر وقت جو آسان نہ ہو سکا
اللہ نے ان کی دعا سن لی اور اللہ اللہ کہتے اس دنیا سے رخصت ہو۔

حلمی افندی

افندی

محمد عباس نام، تخلص حلمی، جناب حلمی کے دادا ڈاکٹر حاجی محمد طالب اور ان کے والد محمد جعفر افندی جو ایک انجینئر تھے ۱۳۱۰ھ قسطنطنیہ سے حیدرآباد دکن آئے اور ترب بازار میں سکونت اختیار کی۔ دکن کے مشہور تذکرہ تنزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ششم صفحہ (۳۸) پر ان دولوں کا ذکر ملتا ہے۔ محمد طالب افندی ڈاکٹر اور ماہر سرجن تھے لیکن محمد جعفر افندی ایک اچھے انجینئر ہونے کے باوجود پیشہ تجارت اختیار کیا۔

جناب حلمی ان ہی محمد جعفر افندی کے فرزند اول تھے دوسرے فرزند عون افندی اس وقت بقیہ حیات ہیں۔ دولوں کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر سٹی ہائی اسکول میں شریک کئے گئے جہاں سے حلمی نے میٹرک کامیاب کیا۔ اپنے نام کے ساتھ ”افندی“ ترکی النسل ہونے کی وجہ سے لکھتے تھے:

کیوں نہ ترکی بہ ترکی وہ بولے
ہو جو حلمی رگون میں ترکی خون

جناب حکمی کی شادی ہمارے محلہ چوترہ سید علی کے ایک قدیم اور مہذب شیعہ خاندان میں جناب احمد رضا صاحب منہدار کی صاحبزادی امیر النساء بیگم سے سنہ ۱۹۳۸ء میں ہوئی جن سے ایک صاحبزادہ علی محمد اندلی اور دو صاحبزادیاں فاطمہ خانم اور اصغری خانم تولد ہوئے۔ سب صاحبزادے مولاد ہیں۔

جناب حکمی اچھے خوش نویس بھی تھے۔ محکمہ باب حکومت کے صفحہ فرماں میں کار گزار رہے انھیں کوئی ترقی نہیں ہوئی کیوں کہ ہر زمانہ میں ترقیوں کا وار و مدار جاد بے جا سفارشوں پر رہا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

عقل و ہوش دہنر ہوا باشد
وقت بد زور و زر ہوا باشد
رہیں چلتی ہے جب سفارش کی
جو نیز سینئر ہوا باشد

سنہ ۱۹۴۸ء حیدر آباد میں ایک تاریخی انقلاب رونما ہوا۔ نتیجہ ”سوالہ حکومت آصفیہ کا خاتمہ ہو گیا اور بادشاہت کی جگہ جمہوریت قائم ہوئی ابتداء میں میاں سی مصائب۔ بے روزگاری اور پریشانیوں کا دور دورہ رہا۔ جناب حکمی حالات کا شکار ہوئے اور بغیر وظیفہ ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ لیکن حضور نظام کی ہربانی سے پرائیویٹ اسٹیٹ صرف خاص میں ”شیعہ کارخانہ جات“ میں ملازمت مل گئی۔ وہ حالات سے متاثر اور دل برداشتہ تھے۔ اقتدار آصفی کی وسعت صرف خاص تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔

اب برائے نام اپنی وضع داری رہ گئی
دل کے بہلانے کی خاطر شہر یاری رہ گئی
رہ گیا باقی معلق اقتدار آصفی
کارخانے رہ گئے نگرانکاری رہ گئی

بالآخر صرف خاص میں بھی تخفیف کا مرحلہ آیا اور جناب حلمی اس کی زر میں آئے لیکن حضور نظام نے دستگیری کی اور ساٹھ روپیہ وظیفہ تاحیات کر دیا۔ ان کے لیے معاشی مصائب بڑے صبر آزار رہے۔ وہ ایک حساس اور خوددار شاعر تھے۔ یہ ان کی ضعیفی کا زمانہ تھا، بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ستم بالا سے ستم انھیں بلد پیشہ ہو گیا۔ ہر سال وہ ماہ صفر میں واسطی اہل حرم کے سلسلہ میں "نشین ابن حزم" کی شبیہ بنایا کرتے تھے اور یہ فریضہ تقریباً پچاس (۵۰) سال سے بارگاہ حضرت ابوالفضل العباسؑ (دیوان دیوڑھی) میں بجالاتے تھے چنانچہ ۱۹ صفر سنہ ۱۳۹۷ھ (۸ فروری ۱۹۷۷ء) صبح چھ بجے اپنے فریضہ کو ادا کرنے منبر پر آئے اور مخصوص انداز میں عربی لباس میں عربی شروع کیا۔ پہلی صدادی اور مجلس عزائم آہ و بکا کا شور اٹھا اور یہ ادھر لڑکھڑائے اور دوسرے لمحہ روح خانہ تن سے نکل گئی شاید اسی دن کے لیے کہا تھا:

دم بھی نکلا نوحان سے نکلا

اور کس آن بان سے نکلا

روح جس وقت جسم سے نکلی

یا محمد زبان سے نکلا

انتقال کے وقت عمر (۵۷) سال تھی۔ تدفین درگاہ حضرت میرمن صاحب (میر کا دائرہ) میں ہوئی۔ قبر درگاہ کے پائین میں اور کتبہ لگا ہوا ہے۔

وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنے اچھے انسان بھی تھے۔ صلح کل۔

راضی برضا، خوش خلق، سیکر المزاج اور خوش یاش و زندہ دل۔ طبیعت میں جیسی سادگی تھی لباس پہنے میں بھی اتنے ہی با وضع اور سادگی پسند تھے۔ تنائش کی تمنا اور صلہ کی آرزو سے بے نیاز رہے:

بارہا ہم نے آزمائش کی
اس کو حاجت نہیں ستائش کی
تو بھی کچھ اپنا ثبوتِ علمی
دُنیا دیوانی ہے نمائش کی
مصر شعراء کی بہت عزت کرتے تھے۔ صنفی اور نگ آبادی کی شاعری
کے بہت مداح تھے :

شاعرانِ دکن میں اے علمی
مجھ کو مرغوب ہے صنفی کا رنگ
حلی کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ حکیم عابد علی غنیور سے کلامِ اصلاح
لی۔ ایک دفعہ حضور نظام نے ان کے کلام لیں ایک لفظ درست کیا تب
سے اس دُستی کو اپنے لیے باعثِ صداختار سمجھا اور نام کے آگے شاگرد
شاہ لکھنے لگے۔ ایک ٹمبے میں کہتے ہیں :
دکن میں کس لیے رتبہ بڑھے نہ علمی کا
خدا کے فضل سے شاگردِ شہرِ یار ہوا
کہاں سے دیکھ کہاں تنگ سخن لے پہنچا یا

نبا ہے شہہ کا مصاحب پھر ہے اترنا
دگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
وہ ایک ہمہ دان پُرگو شاعر تھے۔ غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ رباعیات قطعاً
لفت۔ مرثیہ۔ سلام اور نوحہ سب میں بڑی قادر الکلامی کے ساتھ طبع
آزمائی کی ہے۔ طنز و مزاح کی شاعری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔
سیاسی۔ سماجی اور معاشرتی بُرائیوں اور مغربی تہذیب کی خرابیوں کی
طنز و مزاح کے پردے میں خوب خبر لیتے تھے ایک غزل کے چند
شعر سنئے :-

حُسن بھی ہے نقاب کے پیچھے
 بہر ہے ماہ تاب کے پیچھے
 ہو گئی عمر رائیگاں اپنی
 ایک خانہ خراب ۲
 ہم نے ناحق عذار
 رہ کے راہ تو

میں وہ بے حد سوت روت و اسد
 پڑ نہ جانا جواب کے پیچھے
 تم کو خوفِ خوفِ نہیں صلی
 کیوں پڑے ہو شراب کے پیچھے
 غالب کی کئی غزلوں پر غم سے لکھے ہیں۔ ایک غزل کے دو شعر دل پر
 ان کی تفسیر مجھے پسند آئی

کیا کردل کیا نہ کردل ہے ابھی منزل آگے
 ضعف کے مارے قدم کانپ رہے ہیں میر
 حال یہ ہے کہ جہاں بھیٹ گئے بھیٹ گئے
 بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
 کام وہ آن پڑا ہے بناتے نہ بنے
 شیشہ دل میں سے غلٹ بھری کس کی ہے
 کچھ خبر بھی ہے کہ یہ بے خبری کس کی ہے
 حق کس کا ہے یہ یاد و نظری کس کی ہے
 کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
 پر وہ چھوڑا ہے وہ اس لئے کراٹھائے نہ بنے
 طنز و مزاح میں اشعار خاص انداز سے سناتے تھے،

دیسی انگلش مال برابر
 ہو گئی کملی شال برابر
 فرق نہیں ہے بال برابر
 دولوں میں ہے جال برابر
 کہتے ہیں یہ فال برابر
 گھر کی مرغی دال برابر
 بے حیائی کا دُور دورہ ہے
 کیوں نہ تکلیف ہو دے روحانی
 شکل دیکھو ہمارے لڑکوں کی
 نہ زنائی ہے اور نہ مردانی

وہ بے باکی سے حکومت کے نظم و نسق کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتے
 تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے پُر زور حامی تھے اور انتشار پسند سرگرمیوں کے
 سخت مخالف۔

گھر کے ہر ذرہ کو رشک طور کرنا چاہیے
 گوشت گوشتہ کو غرض پُر لڑ کرنا چاہیے
 آج پھولوں میں جو پیدا کر رہے ہیں انتشار
 ایسے کانٹوں کو چہن سے دُور کرنا چاہیے

میں نے جنابِ حلیمی کے فرزند جناب علی افندی صاحب سے مل کر مجموعہ کلام
 دیکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے صرف دس ورق کی کافی لاکر میرے
 سامنے رکھ دی اور کہا بس اتنا کلام باقی رہ گیا! یہ سن کر میں حیرت سے
 ان کا منہ تکنے لگا کہ حلیمی جیسے پُر گو شاعر کی پچاس سالہ شعرا کرد و کاوش
 کا حاصل صرف یہ دس ورق! ان مختصر اوراق میں جنابِ حلیمی کی کبھی ہسوتی
 دو چار نظموں۔ چند رباعیات و قطعات کے سوا کچھ نہیں لکائی پر
 نام ”مہر الور“ لکھا ہوا ہے۔ دوسرے صفحے پر شمش العلماء بمصور فیضی

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی مرحوم کی رائے جناب علمی کے کلام کے بارے میں درج ہے :

"جناب حکیم محمد عباس علمی افندی کو میں نے ایام قیام حیدرآباد میں کئی بڑے جلسوں میں نظم خوانی کرتے ہوئے سنا۔ حیدرآباد کے ہندو مسلمان ان کی نظموں کو بہت شوق سے سنتے ہیں۔ ان کو حضور نظام کی بارگاہ میں رسائی حاصل ہے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع ان کو شرف ہم کلامی عطا فرماتے ہیں۔ اگرچہ حیدرآباد میں سیاسی انقلاب ہو گیا لیکن علوم و فنون کے لحاظ سے حیدرآباد اب تک اس اونچے مقام پر ہے جس پر وہ صدیوں سے تھا۔ علمی افندی ترکی نسل سے ہیں ان کے بڑھنے کا انداز بہت دکش ہوتا ہے اور وہ فنی جذبات و خیالات کی بہت اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ میں اگر شاعر ہوتا تو ان کی شاعری کی خوبیوں کو بھی یہاں لکھتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ان کا مجموعہ کلام شائع ہونے کے بعد ایسا مقبول خاص و عام ہوگا جیسا کہ عام جلسوں میں ان کی نظم خوانی مقبول ہوتی ہے۔ مری دلی تمنا ہے کہ علمی افندی کا یہ مجموعہ کلام حیدرآباد میں ہمیشہ نیک نام اور مقبول خاص و عام ہوگا۔"

والسلام شرح دستخط - ۱۳۷۱ھ

جناب علی محمد افندی نے بتایا کہ جناب علمی کا کلام ان کی زندگی ہی میں گم ہو گیا اور یہ حقیقت ہے کہ جناب علمی کا کلام گم ہو جانا شعر ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ بھوڑا بہت کلام صاحب ذوق اصحاب کے ہاں محفوظ ہے ان کی ایک نظم "دخاۃ عثمانیہ طغر و مزاح" کا ایک دل چپ رقع ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے۔ بہر تفریح طبع یہ یادگار نظم پیش ہے :

دواخانہ عثمانیہ

ہے جو عثمانیہ دواخانہ
 کیوں نہ ہو یا دگارشاہانہ
 عہد زرین ہے عہد عثمانی
 ہے ہر اک کام جس کا لاثانی
 دل جگر کہتے ہیں یہی ہر آن
 انتظام نظام کے قرابان
 وہ عمارت ہوئی ہے یہ تعمیر
 جسکی سیاح لیتے ہیں تصویر
 جو کوئی دیکھنے کو آتا ہے
 طاق کسری کا بھول جاتا ہے
 کیوں نہ ہو دور شاہ عثمان ہے
 کہ دکن رشک صد گلستان ہے
 یا خدا بہر سید العالی
 رہیں خوش مدظلہ العالی
 ناظم وقت نارسن ورکر
 ہے حقیقت میں مستعد انسر
 ان کا ہر کام ہو جو قابلِ داد
 کیوں نہ سرکار آصفی ہوشاد
 ہے ہر اک وارڈ قابلِ تصویر
 ہے یہ سن صفائی کی تسخیر
 یوں ہے ہر اک پلنگ پر ہمایار
 باڑ کی جیسی ہو چمن میں قطار

بسترے اس طرح ہیں پاک و صاف
چادرِ آب جیسے ہو شفاف

کیوں نہ سوئے سرِ ایک بے چارہ
جب کہ ہو ہر پلنگ گہوارہ

کیا مصارف کا ہودہ دہاں کا شمار
کہ جہاں بے شمار ہوں بیماریاں

کیوں مصارف نہ ہوں دہاں رات
جس کے ہوں سات لاکھ اخراجات

اور جہاں سیکڑوں اطباء ہیں
اپنے جو وقت کے مسیحا ہیں

ساری نرسیں یہاں کی ہیں طاووس
اور ہر اک ڈاکٹر ہے جالینوس

سچ تو یہ ہے کہ یہ مریضوں کی
ہر گھڑی لیتے ہیں خبر گری

صلح ہوتے ہی نرس آتی ہے
محقرامیٹر بھی ساتھ لاتی ہے

ٹمپریچر بخار کا لے کر
پھر محقر کی چلی وہ بادِ سحر

آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے بیمار
ہو گیا یعنی ناشتہ تیار

ناشتہ کیا ہے ان مریضوں کا
اب ذرا گوشِ دل سے سنئے گا

اس طرح کا سلیس آہنچا
جیسے ہو چھریاں کھرا چہرہ

اور کچھ اس پہ ہے لگا سک
جیسے ہو روئے یار پر غمازہ

آپ کیا لے رہے ہو انگڑائی
لبھے چیمو میں چائے بھی آئی
گرم پانی کہیں کہ چائے اسے
کیا کہا جاتے درنہ ہائے اسے

دودھ ہے اس میں اور شکر ہے
کیا بتائیں مزے میں کیوں کر ہے
حسب میں چائے لاتی ہے چستی
یا بڑھاتی ہے اور کھیٹتی

چائے پیتے ہی سو گئے بیمار
وقتاً ربنا عذاب النار
یہ تو اس چائے کی کہانی ہے
فی الحقیقت جو گرم پانی ہے

لو بجے بارہ آئی ہے بسٹری
ہے غذا جس میں ان سریشیوں کی
جب کہ دی جاتی ہے غذا لاکر
غیب ہوتی ہے بھوک چپکرا کر

وہ مزے دار ہوتے ہیں چائوں
جس سے پڑ جائے انٹرویل میں بل
حلق سے جب کہ یہ گزرتے ہیں
اشک رخسار پر اترتے ہیں

یہ تو چائوں کی ہو چکی تعریف
باقی اب سالنوں کی ہے توصیف

سالنوں کا مزہ نہ پوچھتے گا
کبھی کھانسی ہو اور کبھی ٹھسکا

ہم نے بھی آزما کے دکھا ہے
مرچ کی ڈھانس کے سوا کیا ہے

نہیں ہوتے ہیں پھر بھی یہ تائب
کہ چپاتی سے ہے نمک غائب

آنکھ پڑتی ہے جب چپاتی پر
اشتہا لوٹتی ہے چھپاتی پر

کچی روٹی ہی جب میسر ہو
شہتہ دردِ شکم نہ کیوں کر ہو

گر مرلیوں کے ایسے ہوں کھانے
باضمہ کی خیر خدا جانے

ان کو ہلکی سی غذا دیجئے
لیکن ایسی نہ بد مزہ دیجئے

میں نہیں کہتا کہ مشخن دو
میں نہیں کہتا کہ مرغن دو

دال روٹی ہی دو تو ایسی دو
تا یہ بیمار کھا سکیں جس کو

میرے کہنے کا ہے یہی منشاء
تا کہ ہو انتظامِ مطبخ کا

الغرض اس طرح ہو نگرانی
دودھ کا دودھ پانی کا پانی

گر یہ حکمی حکیم ہے زندہ
سلسلہ اس کا باقی آئندہ

نرس

ساری نرسوں میں ایک ہے سندر
 فی الحقیقت میں نیک ہے سندر
 وارڈ میں اپنے جب یہ آتی ہے
 دل کو ہر ایک کے لہباتی ہے
 اس سے سارے مریض ہیں دل شاد
 کیوں نہ ہو جب کہ ہے یہ نیک تہاد
 کیا بتاؤں جو اس میں ہے تسخیر
 جسکی زلفوں میں مرغ دل ہے اسیر
 جب یہ لاکر دوا پلاتی ہے
 تن میں اس وقت جان آتی ہے
 یہ اگر زہر دے شفا ہو جاتے
 خاک دے یہ تو کیما ہو جاتے
 کب تک ہو اس کے چال پر صدقے
 داغ نہ اس کے خال پر صدقے
 اس کا ہر ایک گال جب گُل ہو
 کیوں نہ اس پر نثار بلبل ہو
 اس کے رُخ پر وہ سُرخ ٹھیکا ہے
 جس کے آگے گلاب پھیکا ہے
 اس کی گر روز دید ہو جائے
 اپنی ہر روز عید ہو جائے
 مستند جیسے ڈیوٹی میں ہے
 اور ایسی ہی بیوٹی میں ہے

ایسی کرسیں جو ہوں یہاں دو چار

خود یہ خود شدرست ہوں بمبار

درس ہے ایک سیکڑوں بیمار

جائے تنگ اصمت و مردمان بسیار

بے مہری ارباب وطن کی شکایت حلّی کو بھی رہی،

مانا کہ آج شاعر ملک دکن ہوں میں

یہ بھی ہے سچ کہ زینت اہلچین ہوں میں

غزبت کا کس زبان سے حلّی بھلا کروں

اپنے وطن میں رہ کے غریب الوطن ہوں میں

اس لیے انہوں نے کہا تھا:

دُنیا مُردہ پرست ہے حلّی

بعد مرنے کے قدر ہوتی ہے

اب مرنے کے بعد بھی قدر کہاں ہوتی ہے:

اک رسم حقّی قدیم سو موقوف ہو گئی!

واقعاتی شعر

بزرگوں سے سنے ہوئے شعر ہوں یا کسی شاعر سے کسی واقعہ

پر فی البدیہہ شنیدہ اشعار وقتی طور پر بڑے دل خوش کن اور دلچسپ

ہوتے ہیں۔ اگر ان یادگار واقعاتی شعروں کو کسی بیاض میں لکھ کر سفید

نہ کر لیا جائے تو جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے یہ نقش و نگار طاق

لسیان بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی چند شعر نذرِ ناظرین ہیں:

[۱] قیمت کی یاوری سے ایک صاحب عہدہ دار بن گئے تو ان کا ہاتھ

طرف چھلک اٹھا اور لنگے امر لہو کی برابر ہی کرتے۔ ان کے رنگ ڈھنگ

ایک واقعہ راز درون خانہ نے دیکھا تو انقلابِ زمانہ کا یوں نقشہ کھینچا:

انقلاب دہر سے گویا چوکی کا یا پلٹ
پھر بھی خوبو رہ گئی اسلاف کے اخلاف میں
ساتھ رہتے تھے طوائف کے کبھی جن کے سلف
اب طوائف رکھتے ہیں ان کے خلف اسلاف میں

[۲۱] اگلے وقتوں میں ایک عہدہ دار صاحب سرِ شہ بندوبست میں
بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوئے۔ طبیعت میں ان کی غصہ اور بے اصولی
ان کا اصول۔ ماتحت علمہ پریشان، ترسان، اور نالان تھا۔ اتفاق سے
ان عہدہ دار صاحب کے دونوں کان پیدائشی کٹے ہوئے تھے۔ اس
صورت حال سے نایہ اٹھا کر ایک من چلے نے ایک روز مقوے پر ٹٹے
حروف میں خوش خط یہ شعر لکھ کر صبح کی اولین ساعت میں عہدہ دار صاحب
کی میز پر رکھ دیا۔

یوں ہی گرہوتی رہے گی کاروائی بے اصول
کان کاٹے تھے خدا نے ناک کاٹیں گے رسول

عہدہ دار صاحب اجلاس میں داخل ہو کر اپنی کرسی بیٹھے ہی تھے کہ ان کی نظر
اس شعر پر پڑی۔ پھر کیا تھا قیامت ہو گئی۔ بہت خفا اور آتش زہیر پاتھو
بڑی انکوائری کی مگر ملزم کا سراغ نہ مل سکا۔

[۳۳] یہ اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ ضلع بیدر میں
کھدوائی کے بعد ان دو قدیم قبریں برآمد ہوئیں۔ جب ان قبروں کو کھولا
گیا تو دونوں قبروں کی میت جوں کی توں صحیح و سالم موجود پائی گئیں جیسے کہ
اجلاکفن پہنا کر ابھی قبر میں ٹایا ہے۔ بقول آتش :

ایمانت کی طرح رکھا زمین نے روزِ محشر تک
نہ اک مٹو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

صاحبِ قبر بزرگوں کی کرامت کا بڑا چرچا ہوا۔ ان دونوں استادِ سخن جناب
حبیب اللہ و قیام بیدر ہائی اسکول میں اردو کے مدرس تھے۔ اس موقع

پر موصوف نے دو شعر فرمائے تھے :

مدت کے بعد نکلیں یہاں سے نفس پاک
اللہ کے دلی ہیں یہ دونوں شہید ہیں
لا ریب لے وقتاً یہ کرامت ضرور ہے
بگڑا نہ ایک تار کفن تک جدید ہیں

[۲] ۱۹۵۶ء میں زبان کی بنیاد پر ریاست حیدرآباد کے حقے بخرے ہو گئے اور وہ تین حصوں میں بٹ گیا اور تین اسٹیٹس آندھرا، کرناٹک اور مہاراشٹر امرکا وجود میں آئے۔ اس تقسیم کی وجہ سے جسٹس فضل علی صاحب تھے فضل علی کے نام کی رعایت سے شاعریوں کا نام نکلا ہے :

ہو گیا تقسیم حیدرآباد از فضل علی
سبحے اب یا علی یا علی یا علی

اس موقع پر یہ بتانا ہے محل نہ ہو گا کہ تقسیم ریاست حیدرآباد کا خمیازہ ملازمین سرکار کو بھگتنا پڑا۔ بیشتر ملازمین کی خدمات مہاراشٹر اور کرناٹک اسٹیٹس سے وابستہ کر دی گئیں۔ نتیجہ میں خاصی بڑی تعداد ترک وطن پر مجبور ہوئی۔ ان کی مخلوعہ جائیدادوں پر آندھرا کی برجان ہو گئے حیدرآباد کی مہمان نوازی و مشہور عالم ہے اہل دکن کی مہمان نوازی اور میزبانی کی روایت کو علامہ حیرت بدایونی نے اپنے طرز فکر کے سانچے میں جس خوبصورتی سے ڈھالا ہے وہ اثر انگیز ہے :

روایات دکن کی آخری یہ میزبانی ہے

بساکر مہمان کو میزبان تقسیم ہوتے ہیں

[۵] جناب محمد طفیل مرحوم ایڈیٹر ماہ نامہ نقوش لاہور نے اپنے مضمون ”مخدومی“ میں لکھا ہے :

”جب پہلے پہل شاہ نامہ اسلام لے کر حفیظ صاحب حیدرآباد دکن گئے تو ان کی خوب مخالفت ہوئی۔ امجد حیدرآبادی جیسا شریف النفس

السان بھی کہہ رہا تھا :

ادبار بصورت دبیر آیا ہے
اک شاعر تاریک ضمیر آیا ہے
شاہ نامہ اسلام کا شکول لئے
پنجاب کا مشہور نقیر آیا ہے

(نقوش محمد طفیل ثمر جلد دوم) ۱۲۷

جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب کی تالیف ”بردنی شاہیر ادب اور حیدر آباد“ میں حفیظ جالندھری کا سنہ ۱۹۳۷ء میں شاہنامہ اسلام کی تصنیف و طباعت کے لیے مالی اعانت حاصل کرنے پنجاب سے حیدر آباد آنے کا ذکر ملتا ہے ڈاکٹر صاحب کے آرکائیوز ریکارڈ سے ان کے تحقیقی مضمون کی روشنی میں حضرت امجد کی رباعی حق گوئی اور صداقت خیال کے اعتراف کے ہوا کوئی چارہ نہیں۔

[۶] بعض لوگ اپنی بعض خوبیوں کی وجہ ”استاد“ کے نام سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک استاد کی شادی کی تقریب پر ان کے ایک دوست نے ہدیہ تبرک استاد کی خدمت میں پیش کیا :

آج استاد کی شاہی ہوئی ماشاء اللہ
کس قدر دھوم ہے کیا شان ہے اللہ اللہ
دولہا صاحب کو جو دیکھا تو براتی لولے
لاحول ولا قوۃ الا باللہ !

[۷] راقم کے والد مرحوم کی استاد داغ کے برادر زادہ مرزا امیراد خان نادان سے اچھی خاصی ملاقات تھی فرماتے تھے کہ ایک تقریب میں ہمدردیہ کشن پر شاد تشریف فرما تھے لوگ جب کہ تھوڑے نذر پیش کر رہے تھے ایسے وقت نشہ میں دھت نادان دیبا آگئے دیبا نے روکا اور اندر جانے نہیں دیا۔ نادان نے کاغذ پر ایک شعر لکھ کر کسی نہ کسی طرح ہمدردیہ

کی خدمت میں بھیج دیا۔

نذر دینے کے لیے زر تو کہاں باقی ہے
ایک پیر مردہ سادل سینے میں ہاں باقی ہے
مہاراجہ بہادر شعر پڑھ کر مسکرائے اور فوراً اندر بلا لانے کا حکم دیا
جب نارائن نے آکر سلام کیا تو بطریق قدردانی مہاراجہ نے انھیں اپنی
جیب سے نذر عطا کی۔

آخری چہار شنبہ

راظم المحزون کے والد صاحب مرحوم نے بتایا تھا کہ ان کے بچپن میں
خاص تقاریب میں عید اور تہوار میں استاد اپنے نو عمر شاگردوں کو دلچپ
اور باموقع اشار خوش خط لکھ کر دیا کرتے تھے۔ یہ حیدر آباد دکن کا قدیم
دستور اور تہذیب و معاشرت تھی، والد مرحوم نے چند شعر آخری چہار شنبہ
کے تعلق سے سنائے تھے جو ان کے استاد نے انھیں لکھ کر دیئے تھے۔

آخری چہار شنبہ ہے دانا
باغ و صحرا کی سیر کو حبانہ
قول حضرت نبیؐ نہیں ہے مگر
گلگلے پوریوں کو تلی کھانا

اس آخری چہار شنبہ کے سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپ ہوگی کہ
جناب میں۔ اے مہدی لکھنوی کسی کام سے حیدر آباد تشریف لائے تھے
دہلی کی سنٹرل گورنمنٹ میں اعلیٰ عہدہ پرفائزرہ چکے تھے۔ یہاں ان
کا قیام نظام کلب میں تھا۔ صاحب ذوق اور سخن فہم اور سخن سنج بھی
تھے۔ جن نے ان سے حیدر آباد میں موصوف کا قیام تھا اس وقت آخری
چہار شنبہ کا فائدہ لیا تھا۔ اخباروں میں سیلانی حیلہ اور محوری حیلہ
کی کرا متوں کے اشتہارات کی بڑی دھوم تھی۔ روزانہ اخبارات میں چھپوں

کی فیض رسانی کی باتیں پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ ان کے لیے یہ سب عجیب اور نئی باتیں تھیں۔ چنانچہ ایک دن مجھ نیاز مند کو موصوف نے ایک طبع زار فی البدیہہ رباعی لکھ کر روانہ فرمائی۔ آپ بھی سُنیے اور داد دیجئے :

ہے قاضی الحاجات مبارک چھلہ
 اللہ سے بھی بڑھ گیا ماشاء اللہ
 دولت، اولاد، تندرستی کا خزان
 لا حول ولا قوۃ إلا باللہ

دکن کا ایک نقاد

دکن کی خاک سے کیسے کیسے صاحبانِ فضل و کمال اُٹھے۔ کوئی نامور ہونے اور کوئی گمنامی کے پردے میں روپوش ہو گئے۔ ان ہی میں سے جناب محمد کریم الدین خان ایک گوہرِ شب چراغ تھے جو ”عطارد“ کے قلمی نام سے آسمانِ ادب پر نمودار ہوئے چمکے اور گم ہو گئے۔

جناب محمد کریم الدین خان صاحب، حضرت لذاب مشرن جنگِ فیاض کے بھٹے صاحبزادے تھے جو شہرِ حیدرآباد میں تبارِ یخ ۱۲ ربیع الآخر سنہ ۱۲۹۰ھ پیدا ہوئے۔ قدیم گھراؤں کے قاعدہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اور اس کے بعد قابلِ اساتذہ سے تعلیم و تلمذ کا سلسلہ رہا۔ ان کے والد لذاب مشرن جنگِ فیاض، حضرت شمس الدین محمد فیضؒ کے بڑے عقیدت مند شاگرد تھے۔ حضرت فیضؒ کے انتقال ۱۲۸۳ھ کے بعد پابندی اور مستعدی سے اپنے استاد کا عرس اور مشاعرہ پینا لیس سال تک کرتے رہے اور مشاعرہ کی طرح میں کہی ہوئی اردو اور فارسی غزلیات کو نگلا سنہ فیضؒ کے نام سے شائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر جمعہ اپنی دیوڑھی میں مشاعرہ اور ادبی محفلوں کا اہتمام اور شعرا کی خاطر مدارت کا انتظام بڑی سرگرمی سے کرتے تھے جس کا تفصیلی ذکر مرتفع سخن جلد اول صفحہ ۱۰ پر موجود ہے۔ جناب محمد کریم الدین خان صاحب کی ذہنی تربیت اور شعرداد کا ذوق ان ہی ادبی محفلوں اور اساتذہ سخن کی صحبتوں میں پروان چڑھا۔ نتیجتاً علمی و تحقیقی خداداد صلاحیت کے جوہر چمک اُٹھے۔ اس کے علاوہ جناب فیاضؒ کا نایاب کتاب خاد بھی ان ہی کے تصرف میں رہا جس سے خاطر خواہ انہوں

استفادہ کیا۔ تحصیلداری ورنکل پر مامور رہنے کے بعد تحصیل دار اور مدگار مال ضلع کریم نگرہ کرد وظیفہ حُسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ وظیفہ کے بعد اپنے تعمیر کردہ مکان "کریم منزل" قاضی پیٹھ (ورنکل) میں مستقل سکونت اختیار کی اور اپنے آپ کو کتب بینی کے لیے وقف کر دیا۔ مکروہات دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ فطرۃً بڑے تنہائی پسند تھے۔ صرف کتابیں ہی گویا ان کے دوست اور رشتہ دار تھے۔ مدت تک خاموش مطالعہ اور گوشہ گیری کے بعد اپنے دوست جناب عبدالرزاق صاحب بسمل کے جاری کردہ مابانہ رسالہ "شہاب" حیدرآباد دکن میں تنقیدی مضامین کا سلسلہ بعنوان نقد و نظر، "عطارد" کے قلمی نام سے شروع کیا۔ علمِ ادب کے سچے خدمت گزار اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے خواہش مند اور ہی خواہ تھے کبھی اپنی شہرت اور نام و نمود کے خواہاں نہیں ہوئے۔ نہ سائنس کی نمائندگی نہ صلاح کی پروا۔ قلمی نام "عطارد" اختیار کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ خاموش علم و ادب کی خدمت کریں۔ ہر آدمی کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کوئی مضمون اخبار یا رسالہ میں چھپے اور پھر اپنی انا کی تسکین کی خاطر چھپا ہوا مضمون دوستوں کو دکھاتا ہے اور داد سے خوش ہوتا ہے لیکن جناب عطارد نے عجیب طبیعت پائی تھی کہ برسوں رسالہ "شہاب" میں ان کے معرکہ الآرا تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے جن کی حیدرآباد کے علمی حلقوں میں دھوم مچا رہی لیکن سوائے ایک دو اصحاب کے خود ان کے گھر والوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو علم نہ تھا کہ عطارد کے قلمی نام سے لکھنے والی شخصیت کس کی ہے مرے دریافت کرنے پر جواب دیا کہ "نقد و نظر" کے لکھنے والے کو کیوں دریافت کرتے ہذا اگر شخص اپنی اطلاع کے واسطے پوچھتے ہو تو عطارد کے نام سے جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے اس کا لکھنے والا میں ہوں۔ اگہ کوئی اور دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ لکھنے والا کوئی ہوا اگر صمیم لکھتا ہے تو عمل کرو ورنہ مجذب کی بڑ سمجھ کر پھینک دو۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب ایرج یار جنگ سابق صوبیدار درنگل سے ملنے گئے۔ اتفاق سے صوبیدار صاحب کے ہاتھ میں شہاب کا پرچہ تھا۔ انھوں نے جناب عطار د سے کہا کہ ایک صاحب قلمی نام سے شہاب میں شعرا کے کلام پر تنقید میں لکھ رہے ہیں۔ بہت اچھی تنقید ہوتی ہے۔ یہ سن کر جی جی کہتے رہے مگر یہ نہیں بتایا کہ ان تنقیدوں کا لکھنے والا یہ ناچیز ہے۔ حالانکہ اپنے عہدہ دار پر رعب جمانے کے لیے ماتحتین کیا نہیں کرتے۔ جناب عطار د ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ بلند پایہ تنقید نگار اور نقاد سخن بھی تھے۔ ان کے سفاین اور تنقیدوں کو دیکھ کر ان کی سخن فہمی زبان دانی، فن عروض پر عبور اور صرف و نحو کے قواعد میں ان کی غیر معمولی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ان کی تنقید اور تبصرہ کا مقصد اردو زبان کی اصلاح و ترقی تھا یہ بات انہوں نے بار بار دُمرائی ہے کہ وہ اپنے شک شبہات دُور کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں اور ان کے پیش نظر افادہ نہیں استفادہ ہوتا ہے۔ تنقیدات کے چند اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگی،

[۱] ہم نے کسی کے کلام پر کبھی تنقید نہیں کی بلکہ بادی النظر میں جو عیوب نظر آئے انھیں کو ظاہر کیا محض اس لیے کہ اگر اعتراض صحیح ہے تو آئندہ کے لیے باخبر رہیں اگر اعتراض غلط ہے تو ثنات سے جواب دے کر معترض کو اس کی اپنی غلطی سے آگاہ ہونے کا موقع دیں اس طریقہ سے نہ صرف معترض کو بلکہ دوسرے بہت سے اصحاب کو بھی فائدہ پہنچتا۔ زبان کی اصلاح اور ترقی میں مدد ملتی؟ شہاب خور داد ۱۳۲۹ء

[۲] ایسی تنقید سے مراد اصلی غرض تو یہ ہے کہ خود مصنف یا دوسرے اصحاب بھی اس پر کچھ رائے زنی کیا کریں تاکہ فحجہ کو اور دوسروں کو استفادہ کا موقع ملے۔ شہاب آذر سنہ ۱۳۲۹ء

[۳] ہمارے ملک کے بعض نوجوان تعلیم یافتہ افراد کے مرغوب مشاغل علمی میں سے ایک مشغلہ شعر و سخن کا بھی ہے جس کو ہم تو وسیع ترقی و تصحیح زبان اردو

کے لیے نیک فال سمجھتے ہیں مگر بد قسمتی سے اس مشغلہ میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے اردو ادب جس فہم و تدبیر کا مستحق ہے وہ اس کو حاصل نہیں۔ یہ بھی اس کی بد نصیبی ہے کہ کسی اہل فن سے مشورہ کرنا بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی مفید مشورہ دیتا ہے تو اس کو تسلیم کرنے کے عوض مناظرہ و مباحثہ شروع ہو جاتا ہے ملک کے وہ افراد جن کو ادب و شعر میں درجہ احتصاص حاصل ہے بالکل خاموش ہیں وہ اس معاملہ میں دخل دینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں ان کا ایسا سمجھنا اور خاموش رہنا حق بجانب بھی ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ ان حالات کی اصلاح کا بہتر طریقہ کیا ہوگا عرصہ دراز کے غور و تامل کے بعد مناسب یہی معلوم ہوا کہ بعض نوجوان شعرا کے کلام پر سرسری نظر ڈالی جائے اس سے دو فائدے منظور تھے۔ خود مصنف کی توجہ اس طرف معطوف ہوگی۔ ادب اردو کے شائقین کو بھی غور و فکر کا موقع ملے گا کیوں کہ اس قسم کی علمی مباحث کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ الفاظ کی صحت اور محاورے کی تحقیق ہو جائے۔ میں اپنی کوتاہیوں اور خامیوں سے واقف ہوں مجھے اس کا بھی اندیشہ تھا کہ بعض طبائع کو میرا سرسری نقد بھی ناگوار خاطر ہوگا مگر جب کوئی دوسرا چارہ کار سمجھ میں نہ آیا تو دل کڑا کر کے میں نے اس بدعت کا آغاز کیا..... جن شعرا کے کلام پر میں نے اپنے شبہات ظاہر کیے ان میں کسی سے مجھے شناسائی بھی نہیں پھر ذاتی حسد یا تنقیص کیا معنی۔ شہاب امر راد ۱۳۲۸ھ

جناب عطار نے بیرونی اور مقامی شعرا کے کلام پر بڑی عالمانہ اور محققانہ تنقیدیں کی ہیں۔ بیرونی شعراء میں حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، نانی بدایونی اور ماہر القادری وغیرہ اور مقامی شعراء میں علی اختر، علی منظور، عبد القیوم خان باقی، سکندر علی وجد، صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش اور مخدوم محی الدین وغیرہ شامل ہیں۔ شعراء کے کلام پر ان کی چند تنقیدوں سے ان کے نقد و نظر اور زبان و ادب کا اندازہ ہو سکتا ہے:

[۱] حسرت موہانی :-

تو دُور ہے اور تجھ کو بھٹلایا نہیں جاتا

داسن ترے ہاتھوں سے چھڑایا نہیں جاتا

سعرہ اولیٰ میں حرف عطف ”اور“ کا استعمال بے محل ہے۔ ”اور“ وصل کے واسطے آتا ہے جب کہ دو جملوں یا لفظوں کی حالت میں یکسانی ہو۔ یہاں تو دو جملوں میں مغایرت ہے اس لیے یہ موقع عطف استدراک کے استعمال کا ہے مثلاً تو دُور ہے لیکن تجھ کو بھٹلایا نہیں جاتا۔ داسن چھڑانا اُردو میں ایک محاورہ ہے جو بطور کنایہ بری الذمہ علیحدہ یا جدا ہونے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

داسن چھڑا کے جب سے گیا ہے وہ بے ونا

دانٹوں سے کاٹا ہوں میں بے اختیار ہاتھ (آتش)

مصنف نے محاورے میں تصرف کر کے ”داسن ہاتھوں سے چھڑانا“ کہا ہے جس کی وجہ وہ اب کنایہ نہیں رہا اس کے حقیقی معنی ہی لیے جائیں گے۔

[۲] جگر مراد آبادی :

میں نے جس بُت پر نظر ڈالی جنون شوق میں

دیکھتا کیا ہوں وہ ترا ہی سراپا ہو گیا

کہنا یہ تھا کہ ”جنون شوق“ یا دُور شوق میں جس پر نظر ڈالتا ہوں تو ہی نظر آتا ہے۔ صاف جلدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے۔ مگر ردیف کی خاطر کہہ گئے ”تیرا ہی سراپا ہو گیا“ یعنی تو ہی ہو گیا یہ مہمل ہے۔ اس کا یا پلٹ یا قلبیہیت کو نظر کی کرامت کہیں یا جنون شوق کا اعجاز؟

اس کو شاید ہی میسر ہو کبھی توفیق دید

جو اسیر حلقہ امروز و فردا ہو گیا

اُردو میں توفیق دینا یا توفیق ہونا تو کہتے ہیں مگر ”توفیق میسر ہونا“ نہیں کہتے قطع نظر اس کے یہ موقع ”توفیق دید“ کہنے کا نہیں ہے۔ دولت دید یا

دولت دیدار میسر ہو کہنا چاہیے تھا۔ مصرع ثانی میں ”اسیر حلقہ“ بے معنی ہے اسیر پنچہ کہتے تو مصرعہ بامعنی ہوتا۔ شہاب ۱۲۵۳ھ

یہ فتنے جس سے اک دُنیا ہے نالال

انھیں سے گرئی بازار بھی ہے

”یہ فتنے“ سے کون سے فتنے مراد ہیں اس کا تو کہیں ذکر ہی نہیں دنیا میں سیکڑوں قسم کے فتنے پیدا ہوتے ہیں غالب کی نظر میں سب سے بڑا فتنہ معشوق کی دوستی ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے

ہوے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسمان کیوں

خدا جانے حضرت جگر کے ذہن میں وہ کون سے فتنے ہیں جن سے دُنیا نالاک (۳) ماہر القادری :-

کس کو خبر مرین شب غم نے کیا کہا

کروٹ کے ساتھ آخری ہچکی سُنی گئی

مصرع ثانی میں ”ساقہ“ کا لفظ بے محل استعمال کیا گیا جس کی وجہ یہ معلوم پیدا ہو رہا ہے کہ جس طرح کروٹ کی آواز سُنی گئی اسی طرح ہچکی کی آواز بھی سُنی گئی۔ بالفاظ دیگر کروٹ اور ہچکی

دونوں آوازیں ایک ساتھ سنی گئی حالانکہ کروٹ کو ساعت سے کوئی تعلق نہیں۔ قطع نظر اس کے لفظ ”آخری“ بھی محل معنی ہے اس سے ہچکیوں کا تسلسل ظاہر ہو رہا ہے حالانکہ وہ مقصود نہیں۔

اس جان آرزو کی ندامت بھری نگاہ

محرر میں دادخواہ کے ہونٹوں کو سی گئی

”ہونٹوں کو سی گئی“ بول چال کے خلاف ہے صرف ہونٹ سی گئی کہنا چاہیے

یہ روز برق و یاد یہ غمناک سی نضا

شاید کہیں بنا کے نشین رکھی گئی

بربادی نشین کے واسطے برق و باد کی ضرورت ہو سکتی ہے مگر بربادی نشین کے واسطے غناک سی فضا کا تعلق بہل ہے بنا ہنادن فارسی کا محاورہ ہے مگر اردو میں بنا رکھنا نہیں کہتے بنا ڈالنا کہتے ہیں۔ ع
عشقی نے ڈال مٹی جب قصر محبت کی بنا (ذوق)

ماہر ازل کے روز جو بٹنے لگے نصیب
قسمت میں سیری مرگ سسل لکھی گئی !
”مرگ سسل“ بے معنی لفظ ہے شاعر کے ذہن میں شاید مرگ کی دو قسمیں
ہیں ایک مرگ سسل اور دوسرا غیر سسل مگر ہیں دونوں بھی بہل۔
شہاب ماہ آذر ۱۳۵۵ھ

[۴] فانی پراونی۔

چشم تر حال آثار جنون میں فانی
کھو گیا ہے اسی دریا میں بیابان سیل
”حال آثار جنون“ کی ترکیب ناقابل تقلید حدت ہے۔ ”حال آثار“ صحیح
نہیں دریا میں ڈوبنا یا غرق ہونا تو کہتے ہیں لیکن ”دریا میں کھوجانا“ ”دہ بھی بیابان“
کا قطعاً غیر صحیح ہے تھوڑی سی تبدیلی سے اس کی اصلاح ممکن تھی اس مصرعہ
کویلوں کہیں تو کیا بُرا ہے ع

اسی دریا میں ہوا غرق بیابان اپنا
”چشم حرک دریا سے تشبیہ دی گئی مگر جنون“ کے واسطے ”بیابان“ نہ استعارہ
ہے نہ تشبیہ۔

ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر

عالم ابھی بقیہ زمان و مکان نہ تھتا

پہلے مصرعہ میں ”بھی“ کا لفظ غیر ضروری ہے مگر کیا کیا جائے مصرعہ موزون نہیں
ہوتا۔ دوسرے مصرعہ کے تعلق سے جب کا لفظ ضروری ہے اسی طرح مصرعہ
بال دیں۔ ع۔ ہم ہو چکے تھے دام محبت میں جب اسیر

[۵] علی اختر

حریم کعبہ بندی وہ سرزمین میں نے
 ترے خیال میں رکھ دی جہاں جہین میں نے
 بظاہر پہلے مصرعہ کی ترکیب میں غلطی پائی جاتی ہے "بنانا" اور امدادی فعل "دینا"
 دونوں متعدی ہیں جس کے ساتھ اکثر دو معقول ہوتے ہیں جیسا کہ اس مصرعہ
 میں بھی "حریم کعبہ" اور "سرزمین" دو مفعول ہیں۔ ایسی حالت میں مفعول اول
 کے ساتھ علامت "کو" کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں مفعول اول "سرزمین" ہے
 جو فردت شعری کے لحاظ سے آخر میں واقع ہوا "وہ" ضمیر اشارہ جملہ میں جب
 حرف ربط کے ساتھ آتا ہے تو "اس" سے بدل جاتا ہے "حریم کعبہ" مذکر غیر
 حقیقی ہے اس لیے فعل بھی اس کے تابع ہوگا۔ غرض پہلے مصرعہ کی یہ عبادت
 "میں نے وہ سرزمین حریم کعبہ بندی" غلط ہے اس طرح ہونا چاہیے "میں
 نے اس سرزمین کو حریم کعبہ بنا دیا" شہاب خور دادؒ

۶۰ علی منظور۔ نظم "نظام العمل"

... جب تک پوری نظم نہ پڑھ لی سمجھ میں نہ آیا کہ عنوان کس مناسبت سے
 بنایا گیا ہے۔ اس نظم میں کچھ طفلی، شباب اور کہولت کا ذکر ہے۔ سرکارِ عالم
 اللہ علیہ وسلم کی مدح ہے۔ سید الشہداءؑ کی منقبت ہے اور ارکانِ خمسہ
 مہمرد عظماء عرفی ایک معجون مرکب ہے جس کو عنوان سے کوئی مناسبت نہیں
 نہ مقطع میں "نظام العمل" کا لفظ آگیا ہے غالباً یہ مقطع ہی اس عنوان کی تجویز کا
 نرک ہے۔

وہ سادہ شرارت بھی ہے اب یاد ہے کہ بچوں کو
 آئینہ دکھا کر تجھے کہتے تھے ادھر دیکھ
 اس کے اوپر دو شعر ہیں جن میں طفلی، جوانی، کہولت اور سچوں کی بے دھڑ شرارت
 اور ان کے مچلنے کا تذکرہ ہے مگر اس شعری شرارت کی ایک نئی قسم "سادہ
 شرارت" کا بیان ہے۔ اس "سادہ شرارت" سے قطع نظر آئینہ دکھا کر

ادھر دیکھتے کہنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا ”سادہ شرارت“ آئینہ میں نظر آتی ہے یا ”سادہ شرارت“ کو رفع کرنے کا یہ ٹونا ہے۔ عجیب تزیین کہ کسی کا بچہ ”سادہ شرارت“ کرتا ہے تو ”لوگ“ آئینہ دکھاتے کیوں پھرتے ہیں۔

جس پیار سے بچوں کو تو اب دیکھ رہا ہے
بچہ کو بھی یوں ہی دیکھتے تھے ماں دیر دیکھ

ردیف گر بے کار ہو رہی ہے تو مضافہ نہیں۔ یہ عیب تو اس طویل نظم کے اکثر و بیشتر اشعار میں پایا جاتا ہے لیکن ”ماں دیر“ کے عطف کو ملاحظہ فرمائیے
ماں اردو پدر فارسی ان کا عطف داد سے گنگا جمنی اردو ہے۔

شہاب تیر ۲۸ ۱۳۴۸ ف

{۷} سکندر علی دہلوی :-

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند

گوہر نایاب بن کر رہ گئی !!

آنکھ کو لبزد واحد استعمال کرنے کا یہ محل نہ تھا۔ ایک آنکھ سے کوئی کیوں کر مودہ سکتا ہے کیا رونے والا کانا تھا؟ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ روتے والے کی آنکھ ایک آنسو کی بوند بھی ایک اور گوہر نایاب بھی ایک مگر رونے کی کوئی حد نہیں۔ کیا مسئلہ تثلث کی یہ کوئی نئی تمثیل ہے؟ ”روتے روتے“ کا مفہوم ہے تسلسل یا دوران گریہ مثلاً کہتے ہیں روتے روتے آنکھیں لال ہو گئیں روتے روتے ہنس دیئے روتے روتے سو گئے مگر روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند رہ گئی کہنا تو ہرگز صحیح نہیں۔ روتے روتے آنسو آنکھ سے ٹپک جاتے ہیں لیکن عجب بات ہے کہ کثرت گریہ کے باوجود آنسو کی بوند آنکھ ہی میں رو گئی یہ ”گوہر نایاب“ موتیا بند کے واسطے استیعاب تو نہیں ہے؟ میں نہ شاعر نہ مجھے شاعری کا دعویٰ حسن اتفاق سے ایک مصرعہ ذہن میں آگیا اس کو یہاں اس لیے لکھ دیتا ہوں کہ شاید اس سے مرے اعتراض کی حقیقت پر مزید روشنی پڑ سکے۔

چشم نم سے جوگری آنسو کی بوند
گوہر نایاب بن کر رہ گئی

اب اعتراض تو رفع ہو جاتا ہے مگر پھر بھی یہ امر غور طلب رہ گیا آخر اس شعر کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ روتے روتے آنسو کی بوند کا گوہر نایاب بن جانا یا اس و حرمان کی علامت تو نہیں ہو سکتی۔ آنسو کی تشبہات میں گوہر بھی ایک تشبہ ہے مگر روتے روتے آنسو کی بوند گوہر نایاب بن کر رہ گئی کہنے میں نہ تخیل کا لطف ہے نہ بیان کی خوبی اس قسم کے پیش پا افتادہ مضامین و تشبہات سے جب تک تخیل کا کوئی پہلو نہ نکلے شعر میں جدت و خوبی پیدا نہیں ہو سکتی بہر حال یہ شعر جناب و قد کے شایانِ شان نہیں ہے۔ - شہاب احمد خان

اٹ دی گردش ایام نے نرم قطب شاہی
بجھا دی قصر عادل شاہ کی شمع سرگہری

لفظ قطب میں حرف روم ساکن ہے اس لیے پہلا مصرعہ ناموزوں ہے کیوں کہ شکر نکھا گیا ہے۔ صلیح کا چراغ تو خود ہی بجھا دیا جاتا ہے گردش ایام پر اس کا مظاہرہ کیوں۔

کوئی موتی لٹاتا تھا اپنی چشم پر نم سے
کوئی لیتا تھا افسانہ دگر ملاں سے

جب عشق و محبت کا وجود ہی نہ رہا تو چشم پر نم کیوں ہونے چلی۔ چشم پر نم سے موتی لٹانا بھی ہل سی بات ہے۔ محاورہ بھی اس کی مسامتہ نہیں کرتا۔ اتفاقاً مقام تراشکوں کا لفظ چاہتا ہے موتی بکھیرا تو سنا اور عرس حضرت خواجہ امیری میں دیکھ لٹاتے ہوئے بھی دیکھا مگر موتی لٹاتے نہ دیکھا۔ سنا۔ اردو کے محاورہ میں سبق لینا کہتے ہیں کس "لینا" نہیں کہتے۔ - شہاب احمد خان ۱۳۴۰ھ

[۸] مخدوم محی الدین :- نظم "قمر"

شفق کی پیٹھ کے پچھلے سے آ رہا ہے قمر
زمین پہ نور کی چادر بچھا رہا ہے قمر

شفق اس سرخی کا نام ہے جو مشرق و مغرب میں طلوع یا غروب آفتاب کے
ماقبل اُنق پر نمایاں ہوتی ہے۔ قمر کو شفق سے کوئی تعلق نہیں اس
لیے یہ کہنا کہ ”شفق کی پیٹھ کے پیچھے سے آ رہا ہے قمر“ نہ حقیقتاً صحیح ہے
نہ کنایتاً درست مگر بلحاظ الفاظ ”شفق کی پیٹھ“ تبسم پاش ضرور ہے
اُداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے

کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر
کہاں ہے ساقی نکلے کہاں ہے سُرخ شرب
فسانہ غم گیتی سنا رہا ہے قمر

ختم کلام کے یہ دو شعر تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں بار بار پڑھیے
اور لطف حاصل کیجئے۔ آخر میں اس امر کا اظہار بھی ناگزیر ہے کہ باوجود
سعی بلیغ بعض اشعار کے تعلق سے ہمارے فہم و اندیشہ کا دامن خالی
ہی رہا۔ شہاب شہر پور ۱۳۲۹ء

بخون طوالت ہم نے شعراء کے ایک دو شعر لکھنے پر اکتفا کیا درجہ
جناب عطارد نے ان شعراء کے علاوہ دوسرے شاعران کی تقریباً
پوری غزلوں اور نظموں پر نقد و نظر تبصرہ کیا ہے اور یہ سلسلہ رسالہ
شہاب میں برسوں جاری رہا۔

اس کے علاوہ اساتذہ سخن غالب داغ اوشلی وغیرہ کے کلام پر جو اصحاب
نکتہ چینی یا اعتراض کرتے تھے ان کا مدلل جواب بھی لکھا کرتے تھے۔
چنانچہ حضرت لطم طباطبائی اپنی تالیف شرح دیوان غالب میں غالب کے
اشعار پر محاورہ، زبان وغیرہ کی نسبت جو اعتراضات کئے تھے اور جن
کی صحت میں شبہ تھا اس کا نہایت پرازدِ لائل اور مستند جواب عطارد
نے دیا :-

تناشہ کراے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اعتراض : اردو میں خالی تماشہ کہہ دینا کافی نہیں ہے۔
 جواب : دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن میں شاید ”کر“ کے عوض ”کر“ لکھا
 گیا یا طاعت میں ”کر“ کی ”ر“ پر سیاہی نہ تھی۔ یہ ایک معمولی بات ہے
 اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف ”تماشہ“ نہ فارسی میں بہ معنی تماشہ کرنا
 مستعمل ہے نہ اردو میں۔ درحقیقت مصنف نے ”تماشہ کر“ ہی لکھا ہوگا
 دوسرے تمام ایڈیشنوں میں ”تماشہ کر“ ہی ہے۔ اردو میں تماشہ کرنا کے
 معنی ہیں شہدہ دکھانا یا ایسا کام کرنا جس کو رغبت سے دیکھا جائے

منہ نہ دکھلاوے نہ کھلا ہر بانداز عتاب

کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

اعتراض : آنکھ دکھانا محاورہ ہے خفا ہونے کے معنی میں مصنف نے
 آنکھیں دکھانا بیضہ جمع باندھا ہے مگر فصیح دہی ہے کہ آنکھ دکھانا
 کہیں بافراہ۔

جواب : معلوم نہیں مولانا طابطباتی کے نزدیک آتش و ناسخ بھی فصیح تھے یا
 نہیں غالب اور ذوق تو دہلوی ہیں :

ناسخ ہے دکھائیں یار نے آنکھیں چھپا کے چھاتی کو

عطا کئے مجھے بادام انار کے بدلے

آتش ہے آنکھیں عاشق کو نہ تو لے گل رعنا دکھلا

پستیلین کا کسی نادان کو تماشہ دکھلا

ذوق ہے مسجد میں اس نے ہم نے آنکھیں دکھا کے مارا

کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

نورید امن ہے بیداد دوست جان کے لیے

رہا نہ طرز ستم کوئی آسمان کے لیے

اعتراض : لفظ طرز پہلے مونث تھا اور دلی میں اب بھی مونث ہے مگر لکھنؤ
 میں عام محاورہ اس کے تذکیر کا ہے ہاں چند غزل گو جو زبان میں تمیز کرتے

ہیں وہ اب بھی مونث باندھتے ہیں لیکن خلافت محاورہ معلوم ہوتا ہے کانوں جو اب، لفظ ”طرز“ پہلے سے مختلف فیہ ہے جیسا کہ بیسوں الفاظ میں شیخ ناسخ نے بھی مونث لکھا ہے ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کس بنا پر اس کو خلافت محاورہ کہتے ہیں جب یہ تسلیم ہے کہ دہلی میں اب بھی یہ لفظ تانیث ہی بولا جاتا ہے۔ بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی تانیث و تذکیر میں اختلاف چلا آتا ہے ایسے الفاظ کی نسبت کسی کو خلافت محاورہ کہنے کا کیا حق ہے۔ حکیم سید فاضل صاحب جلال مکھنوی جو اپنے وقت کے استادِ سخن سمجھے جاتے تھے اور غالباً مولانا طباطبائی کے ہم عصر بھی تھے اپنی مولفہ کتاب ”رسالہ تانیث و تذکیر“ میں لکھتے ہیں :

”بیشتر فصحا کے عندیہ میں طرز مونث ہے اور مولف بھی اس کی تانیث کا تائیل ہے“

پچ آپڑی ہے وعدہ دلداری کی مجھے

وہ آئے یا نہ آئے پہ پاں انتظار ہے

اعتراف: مگر کے معنی پر (پہ) سے پر فصیح ہے اور پاں سے یہاں بہتر ہے۔ یعنی دوسرا مصرعہ یوں ہوتا... ”وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے“۔ تو اس میں (پہ - پاں) کے بدل جانے سے بندش اچھی ہو جاتی اور (پہ) کا حذف کرنا محاورے میں بہت ہے کچھ معنی میں خلل ہی نہ آتا... غود ہند میں پچ کا لفظ مصنف کی زبان پر بہ تذکرہ ہے مگر اس شعر میں تانیث غالباً یہ سبب ہوا کہ پہلے یہ دیوان مکھنوی میں چھپا وہاں کاتب نے تصرف کر دیا۔ پھر مصنف نے بھی اسے یوں ہی رہنے دیا۔

جواب: مولانا کے دو اعتراف ہیں ایک (پہ اور پاں) پر دوسرا پچ تانیث و تذکرہ پر۔ اس میں شک نہیں کہ شعراء متاخرین نے صرف استد کے معنی پر (پہ) کے استعمال کو غیر فصیح قرار دیا مگر پاں اور دان آج بھی رائج ہیں اصل میں پاں اور دان یہاں اور وہاں بھی ہے صورت اول میں (ہا)

کو مخلوط التلفظ پڑھا جائے تو رسم الخط میں تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں۔ امیر مینائی۔ ۷

داں لگا ہیں تیز تیز اور یاں تھیں آہیں دلپذیر
وصل کی شب اس طرف افسوں ادھر افسانہ تھا

استاد داغ، ۷

قبر میں بھی نہ بجھی آتش غم والے نصیب
ہم جہاں دلیں ہیں والں زیرِ زین آب نہیں
یہ ایک عجیب بات ہے کہ پہلی اشاعت کے علاوہ مابعد کی تمام اشاعتوں
میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے

وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے
پہلے ایڈیشن کی تصحیح اگر خود مصنف نے کی ہے تو یہ لازم نہیں کہ سہو کاتب
کا ہر جز و کل سہو نظر سے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ کیوں نہ اس کو کاتب کی
غلطی قرار دیا جائے مگر ہمیں کاتب لکھنوی، مطبع بھی لکھنؤ کا پھر ایسی بدگمانی
ان سے کیوں کی جائے۔

پچ بلا اختلاف دہلی اور لکھنؤ دو لڑیاں مونیٹ ہی بولا جاتا ہے
اگر عود ہندی میں تذکیر لکھا گیا ہے تو کہنا کہ ”مصنف کی زبان پر یہ لفظ
تذکیر ہے۔ دلیاں چونکہ لکھنؤ میں طبع ہوا تھا کاتب نے تصرف کر کے
تانیٹ لکھ دیا اور مصنف نے بھی اس کو رہنے دیا۔“ مولانا کی عجیب و
غریب حجت ہے کہیں تو کاتب کی غلطی کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ کاپی
کی تصحیح خود مصنف نے کی کہیں کاتب کی غلطی اس انداز سے تسلیم کی جاتی
ہے کہ گویا کاتب لکھنوی نے مصنف کی غلطی کی اصلاح کر دی جس کو مصنف
نے بھی قبول کر لیا۔ دہلی اور لکھنؤ کی ایسی رقابت میں خدا جانے کیا لطف ملتا ہے۔

ت کفیل عمر و اسد فاضل نشاط
مرگ ناگہان تجھے کیا انتظار ہے

اعترض: دو ہندی جلوں میں صرف عطف فارسی کا ہے یعنی (غفلت کفیل عمر ہے واسد ضامن نشاط) دیکھو واؤ فارسی کا یہاں کیسا برا معلوم ہوتا ہے یا یوں سمجھو کہ (غفلت کفیل عمر ہے اور اسد ضامن نشاط ہے) بہر حال دونو ہندی جملہ اور حرف عطف فارسی کا بڑا ہے۔ اس سبب سے کہ ”ہے“ کا لفظ یہاں مذکور نہیں مقدور تو ہے ہاں یہ تاویل کر لو کہ پہلا مصرعہ فارسی کا ہے۔ جواب: تلاشِ عیوب کے انہماک و استغراق میں ہنر بھی عیب نظر آتا ہے پہلا مصرعہ صریحاً فارسی ہے کسی تاویل و تعبیر کی مطلق ضرورت نہیں خواہ مخواہ لفظ ”ہے“ کو مقدور فرض کرنا سراسر نا انصافی ہے مدر کا طالب علم بھی اس سے ناواقف نہیں کہ دو ہندی جملے یا دو ہندی الفاظ کا عطف فارسی (واو) سے ناجائز ہے اگر مولانا طباطبائی اس کو صفتِ تلحج قرار دیتے تو کیا ہرج تھا۔

شہاب مورخہ فرہدی ۱۳۴۷ھ

ان کی ادبی سرگرمیاں صرف تنقید اور جواب تنقید تک محدود نہیں ہیں بلکہ اردو شعروادب پر بڑے نکتہ سنجانہ اور پُر ازان معلومات مضافاً ان کے قلم کے رہن منت ہیں جو فیضاً ادب کے قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ادبی و تحقیقی کام کرنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ ان کے کام میں ان کی رہنمائی اور مدد کرتے تھے چنانچہ مرقع سخن جلد اول، دوم اور چہارم اور فیض سخن کی ترتیب و طباعت کے وقت ڈاکٹر زور کی خواہش پر دکن کے بعض شعراء کا کلام اور حالات زندگی لکھ کر انھیں بھجوا دیا جس کا اعتراف، تعریف اور شکریہ ڈاکٹر زور نے ان کتابوں میں کیا ہے۔

دکن کی سرزمین پر بے مثل شاعر، ادیب اور نقاد و محقق پیدا ہوئے لیکن یہ حقیقت بڑی افسوس ناک ہے کہ خود اہل دکن نے اپنے باکمالوں کی قدر نہیں کی اور باہر سے آنے والے شاعر اور فن دانوں ہی کی قدر منزلت ہوتی رہی۔ تب ہی تو مائیل دکنی نے بے مہر تی یا ران وطن پر یہ طے

نشوونما پائی ہے دکن میں قدر ہماری کیا ہوگی
گھر کی مرغی دال برابر کس کو دکھائیں اپنا ہنرم

بیرونی شعرا اور مشاہیر جن پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے ہوئے ہیں ان پر یہاں سینا یہ موقوف ہے ان پر مقالے پڑھے جاتے ہیں لیکن دکن کے بلند پایہ اساتذہ سخن، بے مثل ادیبوں اور ہمہ دان کامل الفن نقادوں اور محققین سے خود اہل وطن نادارقت ہیں۔ نہ ان پر ریسرچ ہوتا ہے نہ سمیٹا ہوتا ہے نہ مضامین لکھے جاتے ہیں نتیجتاً یہ باکمال پردہ گمائی میں روپوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض تو ایسے بھی ہیں جنہوں نے ان باکمالوں کے تحقیقی اور ادبی کارناموں کو شک شبہ کی نظر سے دیکھا ہے۔

نواب عزیز یار جنگ عزیز نے جناب فانی بدایونی کے مجموعہ کلام ”باتیات فانی“ پر سخوراء تنقید کی جسے جناب ڈاکٹر سید محی الدین زور نے ”نقد سخن“ کے نام سے ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شائع کیا تھا لیکن بغضوں نے نواب عزیز کو فانی کے مخالف گروپ کا سمجھا اور ان کی تنقیدوں کو بد نیتی اور رشک و حسد پر محمول کیا کہ اس کا مقصد ہمارا جہ بہادر شاد کے دربار میں جناب فانی کی وقعت کو گھٹانا قرار دیا اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب عزیز، ہمارا جہ بہادر شاد کے با اعتماد دوست تھے۔ جو لوگ ان کی شخصیت سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ شاعروں کی جھٹ بولیوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا وہ بڑے مستغنی المزاج اور یادداشت تھے شاعروں کے قدر دان اور شعرداد کے خاموش خدمت گزار تھے ان کی تنقیدیں خالص علمی و تحقیقی مباحثہ کا درجہ رکھتی ہیں اس کا مقصد زبان اردو کی ترقی اور اسے سوزنا اور نکھارنا ہے ذاتی منفعت اور شہرت یا بی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس طرح ان کے حیاتی حقائق

نے بھی جو تنقیدیں کی ہیں وہ ایک ادبی کارنامہ کے درجہ میں ہیں ان تنقیدوں میں کسی کی خصوصیت کو دخل نہیں ہے۔

دراصل نواب عزیز اور ان کے بھائی عطار دکن کے ان فرزندوں میں ہیں جنہوں نے اہل وطن کے احساس کمتری اور اس مرعوب فہمیت کو دور کرنے کی کوشش کی کہ زبان دانی صرف دہلی یا لکھنؤ کی میراث ہے۔ دکن والے اہل زبان نہ سہی لیکن ایسے زبان دان ہیں کہ دہلی و لکھنؤ کے دعویدار سخن کے کلام میں زبان و بیان، محاورہ کی غلطی، صرف دسحو کے قاعدوں سے انحراف پر گرفت کرنے کی کما حقہ صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں۔

جناب عطار دکن کا انتقال بھمبر (۹۶) سال ان کے مکان کریم منزل قاضی پیٹھ میں تاریخ ۳ مئی ۱۹۶۶ء (۵۱۳۸۶) ہو گیا۔ ان کی تدفین حضرت افضل شاہ بیابانیؒ کے پائین میں ہوئی۔ اللہ عز و جل رحمت فرمائے۔ جناب عبدالرزاق صاحب نیشنل ایڈیٹر رسالہ شہاب (حیدرآباد دکن) نے جو جناب عطار دکن کے قدیم قریبی دوست تھے انھیں اپنے ایک خط میں لکھا تھا:-

”بیشتر حضرات کا تقاضہ ہے کہ اب تک جو تنقیدیں آپ کی شائع ہو چکی ہیں اگر وہ کتابی صورت میں یکجا کر دی جائیں تو نہایت سودمند ثابت ہوں گی۔ اس مسئلہ میں آپ بھی سوچتے جب کہ فانی پر تنقیدیں کتابی صورت میں نکل چکی ہیں تو یہ بھی اکٹھا طبع کرنے میں آپ کو تامل نہ کرنا چاہیے۔ ایک مستقل شے طالب علم اور ارباب ذوق کے ہاتھ آجائے گی۔ بہر حال آپ کے صواب دید پر منحصر ہے۔“

(خط ناچیز کے پاس محفوظ ہے)

معلوم نہیں اس خط کا جناب عطار دکن نے کیا جواب دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنی گرفتار تنقیدوں اور معلومات افزا مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے میں آپہنوں نے کوئی دل چسپی نہیں لی اور یہ قیمتی

ادبی سرمایہ عرصہ شہاب کے ماہ ناموں میں بکھرا پڑا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر معنی تبسم صاحب جو سلف کے کارناموں کو منظرِ عام پر لانے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ جناب عطار د میرے بزرگوں میں ہیں تو موصوف نے مجھے خط لکھا اور فون پر اس خلش کا اظہار فرمایا کہ جناب عطار د پر میری ایک تعارفی مضمون لکھوں اور ان کی تنقیدوں پر تبصرہ کروں۔ باوجود کم علمی تعمیل ارشاد میں تعارفی مضمون لکھنے کی کوشش کی ہے اب رہا تنقیدوں پر تبصرہ کرنا تو یہ کسی اہل علم اور نقاد سخن ہر کا کام ہے۔

صدق جاسی ہمارا جہ شاد کے دربار میں!

ان کا نام نامی مرزا تصدق حسین تھا۔ جاسی ضلع رام پور بریلی لکھنؤ کا ایک مردم خیز قصبہ ہے یہیں وہ پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کس درس گاہ میں پائی یہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہر حال ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ شمالی ہند میں گزرا۔ وہ پہلے پہل سنہ ۱۹۲۳ء میں حیدر آباد وارد ہوئے اور اپنی شاگردی کی نسبت سے استاد السلطان جلیل اللہ نواب فصاحت جنگ جلیل کی دلیوڑھی جلیل منزل واقع بازار نورا الامراء میں بہان بطور فرد کش ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدر آباد میں ترقی تعلیم کا ہر طرف چرچا تھا۔ بلکہ واضلاع میں نئے نئے مدارس کھل رہے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ دارالترجمہ کے قیام کو چند ہی سال ہوئے تھے سارے ہندوستان میں اس کی شہرت تھی۔ گوشہ گوشہ سے مشاہیر علم و فضل بلائے جا رہے تھے۔ صدق صاحب نے بھی اسی مقصد سے حیدر آباد کا رخ کیا تھا۔ ان جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری کے امیدوار تھے۔ جلیل منزل میں قیام کے دوران جو آٹھ ماہ تک رہا، حیدر آباد کے بالآخر حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر چکے تھے۔ ہمارا جہ کشن پر شاد پشکار دولت آصفیہ کے دربار میں بھی رسائی تھی۔ ہمارا جہ اہل علم کے نہ صرف قدرداں تھے بلکہ حتیٰ الوسع ان کی دستگیری بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ان دنوں وہ صدارت عظمیٰ سے سبکدوش تھے۔ صدق صاحب کی مدد سے قاصر رہے ریاست حیدر آباد میں ملازمت کے لیے صداقت نامہ ملکی کا لڑوم تھا۔ بیرونی افراد کے لیے حصول ملازمت میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ صدق صاحب ملازمت کے لیے کوشاں تھے۔ اس اثنا میں انہوں نے بڑی کوشش و کادش سے صداقت نامہ ملکی تو حاصل کر لیا مگر

حیدر آباد میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی جس سے محفوظ رہنے کے لیے انھیں
ناچار وطن لوٹ جانا پڑا۔ وہاں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ ایک دو
ماہ نہیں لگا تاہر چار سال گزر گئے۔

حیدر آباد کی کشش ایسی رہی کہ وہ یہاں آئے بغیر نہ رہے۔ اس
مدتِ مدید میں حیدر آباد کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ چودہ برس کی
سبکدوشی کے بعد ہمارا جہ کشن پر شاد پھر صدارتِ عظمیٰ پر فائز ہوئے جس
سے حیدر آباد کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مدق صاحب نے اس موقع
کو غنیمت جان کر اٹھائیس اشعار کا ایک قطعہ تہنیت لکھا اور ہمارا جہ کے
ہاں پہنچ کر سردار اپنے خاص انداز میں سنایا۔ چند شعر یہ ہیں:-

جس دن سے تھی صدارتِ عظمیٰ پہ قیل و قال
اہلِ دکن کے دل کے بہت اضطراب میں

بیچ ایسا آ پڑا تھا کہ اربابِ حل و عقد

رہتے تھے جس سے آٹھ پہرا اضطراب میں

خود بادشاہ کھوج میں مدت سے تھے مگر

چھتا نہ تھا کوئی نگہ انتخاب میں

پھائی ہوئی گھٹا تو غم انگیز تھی مگر

دل بولتا تھا چاند بھی ہے اس صحاب میں

شکر خدا کہ نگلشنِ عالم کے دن پھرے

آئی بہارِ باغِ جہاںِ خسراب میں

جس ماہ آسمان وزارت کے دور میں

ظلمت کا منہ کسی نے نہ دیکھا تھا خواب میں

چودہ برس کے بعد وہی چودویں کا چاند

پر تو لنگی ہے پھر شربِ آفتاب میں

کا فر بتوں کے سامنے سجد میں گر پڑے
 لاہد نے شکر بھیجا خدا کی جناب میں
 خالی ہے زر سے ہاتھ تو آیا ہوں شرمسار
 دستِ یمن شاہِ دکن کی جناب میں
 ایسا ہے دل کا مجھ سے کہ گوہرِ نثار کر
 موتی، میں کچھ ابھی مری چشمِ پُر آب میں
 اے لورِ دُنا، عرصہ ہستی کے بادشاہ
 جب تک ضیا ہے ماہ میں لورِ آفتاب میں
 دولتِ جنابِ شاد کے قدموں سے منٹے
 نصرت رہے جلو میں سعادتِ رکاب میں
 اہلِ دربار اپنی جگہ لطفِ اندوز ہوئے اور خود مہاراجہ اس درجہ متاثر
 ہوئے کہ شاداں و فرحال اپنی مسند سے سرِ قد اٹھ کر داد و تحسین دی۔
 ادھر جامعہ عثمانیہ میں صدق صاحب کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا
 انھیں قوی اُمید تھی کہ مہاراجہ کی توجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب
 ہو جائیں گے لیکن ایک مشکل یہ آپڑی تھی کہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسری یا
 لکچراری پر تقرر کے لیے سندِ قابلیت درکار تھی جس سے استثنائے
 کوئی صورت نکل نہ سکی۔ بالآخر صدق صاحب اس کے متبادل کسی اور جائیداد
 پر تقرر کے لیے مہاراجہ کا تعاون چاہتے تھے جس کا وعدہ بھی تھا مگر
 اس میں تاخیر پر تاخیر ہو رہی تھی جو جناب صدق کے لیے ناقابلِ برداشت
 تھی۔ ان کا پیائد صبر چھلک گیا۔ ایک شکوہ آمیز قطعہ لکھا اور پھرے دربار
 میں مہاراجہ کو پیش کیا۔ انھوں نے صدق صاحب کی زبانی سننے کی خواہش
 کی۔ پھر کیا تھا۔ جناب صدق نے بہت جوش و خروش سے وہ قطعہ پڑھا۔
 ابتداء کے چند شعر مدح و توصیف میں تھے وہ مہاراجہ نے بڑے شوق

اے سکندر حشم و حاتم دنیا میں درحسیم
اے فریدوں خدم و بازل و ذلیقہ و جلیل

تیرے اخلاق تری نیک دلی پر شاہد
تیرے الطاف تری بندہ لوازی پر دلیل

تیری ہر بات حکیموں کے لیے قابلِ وقار
تیرا ہر فعل زمانہ کے لیے اک تمثیل

تیرا ہر لفظ ہے گنجینہ معنی کا طلسم
تیرے ہر فقرے کی سوطر سے ممکن تاویل

دستگیرِ اہل ہنر کی تری ذی حوصلگی
سیرِ چشمی تری ہر صاحبِ حاجت کی کفیل

شاعری میں مجھے حاصل تجھے بخشش میں کمال
مثلِ میرا ہی زمانے میں نہ تیرا ہی عدلی

فخرِ ممدوح کی عزت سے ہے مدح کو بھی
یہ وہ دعویٰ ہے تری شان ہے حکمِ دلیل

جب آگے یہ بچھتے ہوئے شعر پڑھے گئے
شرم آتی ہے جو احباب کبھی پوچھتے ہیں
آج تیرے لیے کیا کوئی نکلی نہ سبیل

دَم ہے سینہ میں خفا اتنی بھی تاخیر ہے کیا
گویہ تاخیر ہے مقصدِ بہ درستی کی دلیل

شوقِ بے چینی ادھر اور تمنا ہے تاب
مدتِ وعدہ حیاں بخش ادھر طولِ طویل

ایسے وعدہ کو ہے درکارِ حیاتِ ایسا
اس سے سربِ نہیں ہو سکتی مری عمرِ قلیل

قدر دانی تو ترے دل پہ ہے موقوف مگر
قابل داد نہیں کیا یہ اچھوتی تحصیل

کس کی توہین ہے عالم میں اہانت میری
کس کی ذلت ہے زمانے میں رہائیں جھڑیل

ہمزبان ہو کے مرا غالب آشفۃ بیان
تیری خدمت میں ان اشعار سے کرتا ہے اپیل

”نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل“

”قبلہ کون و مکان خستہ لازی میں یہ دیر
کعبہ امن و امان عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل“

مہاراجہ سکرنے لگے۔ ان کی مسکراہٹ معنی خیز اور امید افزا تھی۔ بعد
چندے ان کے ایسا سے جناب صدق کا تقرر مدد فوائدیہ دارالعلوم بلدہ کی
مدری پر عمل میں آیا اور یہ سلسلہ لازمت تاد ظیفہ حسن خدمت جاری رہا۔
مصنف کی زیر ترتیب کتاب (صدق جانیسی، سوانحی خاکہ اور کلام) سے۔

حسن ترجمہ

عبد الرحمن عمادی علامہ عمادی کے محبوب ترین بھائی تھے عمر میں گو
ان سے چھوٹے تھے مگر علوم و وجہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے حضور
میں حافظ علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھا گیا۔

قتل ایں خستہ بشمیر تو تقدیر نمود
ورنہ ہیچ اذ دل بید رحم تو تقصیر نمود
آنر حرم نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

میں تہہ تیغ ہوں ایسی مری تقدیر نہ تھی
ورنہ تیرے دل بے رحم کی تقصیر نہ تھی

صاحبزادہ عثمان عمادی (فرزند علامہ عمادی) نے حافظ کا یہ مشہور شعر

آسائش دو گیتی تقصیر ایں دو حرفت
باد و ستاں تلطف باد شمنان مدارا

سنا تو اس کو یوں اردو قالب میں ڈھال دیا:

دو لوں جہاں کی خوشیاں دو حرف میں ہی پھر

یاروں سے کر تلطف دشمن سے کر مدارا

صاحبزادہ عثمان عمادی ایک دن امام الفن و ادب فصاحت و جگ جلیل سے ملے
گئے۔ نواب صاحب کا خطاب جیسا جلیل القدر تھا ویسے ہی وہ جلیل القدر شاعر
ہونے کے ساتھ اعلیٰ سکرام اخلاق و حسن التفات سے مزین تھے۔ ان کو دیکھا
تو کھڑے ہو گئے اور اس غلو سے بے گویا دیرینہ محبت و موانست تھی
ہنایت ہریانی سے خیریت اور گھر کے حالات پوچھنے لگے اور ادب کی باتیں
ہونے لگیں اس اشائی میں کچھ اور لوگ بھی آگئے اور شعر و شاعری کا بازار گرم

ہو گیا جس میں کم عیار نکال سے باہر ہو گئے اور سیم و زر کے خالص سکے چلنے لگے
باتوں باتوں میں کسی نے حضرت جلیل کا شعر پڑھا

مست کرنا ہے تو خم منہ سے لگا دے ساقی
تو پلائے گا کہاں تک مجھے پیمانے سے
میں کر مسکرایا اور اسی مفہوم کو فارسی میں یوں ادا کیا ہے
خواہی مستم کنی خم را بہ لبم دہ ساقی
باتنک ظرفی پیمائے تسلی تا کے

حضرت جلیل بے حد خوش ہوئے اور ہاتھ بڑھا کے مصافحہ فرمایا اور بڑی تعریف کی
اسی محفل میں استاد جلیل کے دو اور شعر پڑھے گئے:

جب تم ملے نہ تھے تو جبرائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نیکل گئی
خدا جانے حقیقت کیا ہے لیکن میں یہ سننا ہوں
اُٹھے گا نقنہ محشر تمہاری چشم پرُفن سے
ان اشعار پر یوں طبع آزمائی کی:

تا دید مت ملال تمناات داشتم
اکنون ملال این کہ تمنا فراغ شد
حقیقت را نمی دانم زیاراں این خبر دارم
کہ چشم پرُفت آن نقنہ محشر کند بر پا
ایک صاحب نے حافظ کا یہ شعر پڑھا:

دلے کہ غیب نہایت و جام جم دارد
ز خاتمی کہ از او گم شود چہ غم دارد
اس پر برجستہ کہا:

وہ دل جو غیب نہا اور جام جم سلہو
اسے اک خاتم گم گشتہ کا الم کیا ہو

مہاراجہ سرکشن پر شاد شاد کا خط

مئی ڈیسر عزیز یار جنگ بہادر

آپ کا محبت نامہ مع غزل پہونچا۔ مشاعرہ کے روز بہت دیر تک میں
نظر تھا کہ آصف یاد الملک بہادر یا آپ حب عادت مجھے طلب کریں تو آؤں
لیکن کون یاد کرتا ہے۔ خیر میرا کلام آپ کے اور سامعین کے جو پسند آیا
اور پڑھا گیا گویا میری حاضری ہو گئی۔ آپ نے غزل بہت اچھی کھی۔ کلام
کی پختگی اور محاورہ اور تشہیں استعاروں کا کُطف اب ترقی پر ہے
اللہم زد خزد۔

آپ کی فرمائش تھی اس لیے ان غزلوں کے لکھنے میں کسی قدر طبیعت پر زور
دیا گیا ورنہ اب میں بہت کم لکھتا ہوں اور ایسی وجہ سے تکلف بھی ہوا ورنہ
بیس پچیس شعر اپنا پشناپ کہہ دینا مرے نزدیک ایک معمولی بات تھی ہاں
کیا کہوں۔

سینہ و دل حیرتوں سے چھپا گیا
بس ہجوم یا کس جی گھبرا گیا

آصف پر شاد کی موت نے کہیں کا نہ رکھا۔ آپ کی غزل کا ایک شعر بالکل مرے حسب
ہے اور درحقیقت آج کل مرا بھی حال ہے۔

ہم تو کچھ اور ہی عالم میں رہا کرتے ہیں نہ تو ہوتی ہے مسرت نہ تو غم ہوتا ہے
پر سول شب میں دُوبے تک نیند نہیں آتی۔ دل پُر غم کو بھلاتا رہا۔ کچھ اشعار جو موزوں
ہوئے ہیں وہ رشتہ دوز ہیں۔ ایک جلد فریاد شاد کی بھی پیچھا ہوں۔ یہ سرور زندگی
غم کا شریہ ہے۔ دُعا کیجئے کہ خدا مرے حال پر رحم کرے۔ اب تو ہر سول درشن کو نیتان
ترست ہیں۔
شہزادہ غلط بہادر مہاراجہ شاد

